میر سامان وجود

جہاں سرائے ہستی میں
انسانی اختیار اور ذمہ داری

حسن عبدالحکیم Gai Eaton

ترجمہ: محمد سہیل عمر ، نعمانہ عمر

میرسامانِ وجود

جہاں سرائے ہستی میں انسانی اختیار اور ذمہ داری

KING OF THE CASTLE

Choice and Responsibility in the Modern World

میرِ سامانِ وجود

جہاں سرائے ہستی میں انسانی اختیار اور ذمہ داری

حسن عبدالحکیم Gai Eaton

ترجمہ: محمد سہیل عمر، نعمانہ عمر

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر
اقبال اکادمی پاکستان
(حکومتِ پاکستان، وزارت ثقافت)
چھٹی منزل، ایوان اقبال، لاہور
Tel: [+92-42] 6314-510
Fax: [+92-42] 631-4496
Email: director@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN 978-969-416-393-2

طبع اوّل : ۲۰۰۷ء
تعداد : ۱۰۰۰
قیمت : ۱۵۰ روپے
مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

محل فروخت: ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور، فون نمبر ۷۳۵۷۲۱۴

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

''ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ معیاری انسان کے اس تصور کے حوالے سے ہے جو اس کے بارے میں ہمیشہ ہر زمانے اور ہر ثقافت میں رکھا گیا۔ ہر ثقافت میں انسان کی فطرت اور اس کے مرتبے کا تصور ایک ہی رہا ہے، سوائے موجودہ مغربی تہذیب کے اور وہ تصور تھا خلیفۃ اللہ کا جو اپنی نیلی سبز دنیا میں اپنے ربّ کے رُوبرُو ہے۔''

[ابتدائیہ]

ترتیب

گزارش

باب اوّل

ابتدائیہ ۱

باب دوم

جعلی بستیاں ۱۹

باب سوم

خمیازۂ زر ۴۳

باب چہارم

انسان اور معاشرہ ۶۵

باب پنجم

آدمی - خلیفۃ اللہ ۹۷

باب ششم

ہمارا واحد ورثہ ۱۳۳

گزارش

اسلام کے تصورِ انسان کی ایک بامعنی اور اہم تعبیر جس بیانیے کے توسط سے عہد جدید میں منظرعام پر آئی وہ علامہ اقبال کا تصورِ خودی ہے۔ فکر اسلامی کے خزینے کا فشردہ، جدید انسان کے لیے دانشِ قدیم کی یادآوری اور بازیافت کا وسیلہ۔ یہ درسی کتب اور سائنسی کلیوں کے محیط کی چیز نہیں، اپنے آپ کو جاننے اور اپنے مرتبۂ وجود کو سمجھنے کی دعوت ہے۔

یہ کتاب جو ترجمے کی صورت میں آپ کے سامنے ہے، روایتی تصورِ انسان کو بیان کرتی ہے اور اس رزمیے پر ایک مفصل نظر ڈالتی ہے جو آج کی دنیا میں دین ودانش کی بنیاد پر زیست کرنے والے افراد کا رزمیہ ہے۔ اسلام کے تصورِ انسان کو، یا بالفاظ دگر، انسانی خودی کو، فکر وعمل کی سطح پر خود شناسی اور جہاں شناسی کے حوالے سے آج کی دنیا میں کیسے مسائل اور خطرات کا سامنا ہے یہ اس کتاب کا مرکزی موضوع ہے۔ آج کی پیچیدہ اور مسائل میں گھری ہوئی اجتماعی زندگی، ادارے اور تحریکیں، ریاست اور سیاست نیز رجحانات اور فکری رویے انسان پر کیسا کیسا دباؤ ڈالتے ہیں کہ وہ خود کو بھلانے پر مجبور، اپنے مقصدِ وجود سے غافل اور اپنی آخری منزل سے روگرداں ہوتا چلا جاتا ہے۔ دانشِ قدیم کے نقطۂ نظر سے اور علامہ اقبال کے تصورِ خودی کے پس منظر میں یہ کتاب قاری کو انسان، انسانی ماحول اور انسانی فطرت پر دوبارہ غور کرنے کی دعوت دیتی ہے اور یاد دلاتی ہے کہ حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں کچھ بنیادی حقائق ایسے ہیں جنھیں بہرصورت نظر میں رکھنا لازم ہے کہ ہمارے فیصلوں اور اختیار کردہ راستوں کی ذمہ داری آخرالامر ہماری طرف لوٹتی ہے۔ زمانِ گزراں کا دھندلکا چھٹنے اور یومِ آخر کا اجالا پھیلنے کے بعد جوابدہی کے لیے ہمیں فرداً فرداً ہی حاضر ہونا ہوگا۔ وہی لوگ دانش مند کہلائیں گے جو اپنی فردِ عمل کا حساب روزِ فردا کے لیے اُٹھا نہ رکھیں! دن ڈھل چکا ہے مگر ابھی مہلت عمل باقی ہے۔

باب اوّل

ابتدائیہ

اگر آج کا کوئی آدمی کسی انوکھے جتن سے ماضی میں داخل ہوکر کسی زمانۂ بعید میں پہنچ جائے اور اس عہد کے لوگوں میں گھل مل جائے تو بہت سی باتوں میں یا تو اس کو اپنے اوپر جنون کا گمان ہوگا یا اُنہیں پاگل سمجھے گا۔ پہاڑ، دریا اور نیلگوں آسمان تو اس کے جانے پہچانے ہوں گے مگر اس دور کے لوگ انھیں اس انداز سے قطعاً نہیں دیکھتے ہوں گے جس نقطۂ نظر سے وہ دیکھ رہا ہوگا۔

اسے یہ پتہ ہوگا کہ حسِ سلیم (common sense) کیا چیز ہے اور نارمل انسان کسے کہتے ہیں؟— یہی بات اس دور کے لوگوں کو بھی معلوم ہوگی— مگر اس کی حسِ سلیم ان سے مختلف ہوگی اور اس کا عام اور معیاری، ان کے لیے غیر معمولی اور بگڑا ہوا ہوگا۔ ان کے مسلّمات اس کے لیے سوالیہ نشان ہوں گے اور وہ پریشان ہوگا کہ انھوں نے ان کو بے چون و چراں کیونکر مان رکھا ہے؟ اسی طرح وہ تمام باتیں جن کو وہ مسلم اور بدیہی سمجھتا ہوگا، ان کے سوالوں کی زد پر ہوں گی۔ اس کے ''کیوں'' کا سامنا ان کے ''کیوں'' سے ہوگا اور جواب کا اسے کچھ پتہ نہ ہوگا۔

اپنے موجودہ مقام پر کھڑے ہوکر ہم یہ سوچنے میں شاید حق بجانب ہوں کہ پچھلے زمانے اور دوسری ثقافتوں کے لوگوں کے اعتقادات اور خیالات کتنے محدود تھے، کتنی ہی راہوں کا کسی نے کھوج نہ لگایا تھا اور کتنے ہی امکانات ضائع کر دیے جاتے تھے۔

اسی طرح یہ بھی فرض کر لینا بڑا آسان ہے کہ ہم اپنے تناظر کی تبدیلی کی وجہ سے انسانی بصارت اور فکر کی خلقی قیود سے آزاد ہوگئے ہیں جبکہ ہماری تمام حسیات اور ہمارے سارے قویٰ اور صلاحیتیں وہی ہیں جو پہلے تھیں۔ ہم کوئی نئی نوع (Species) نہیں بن گئے۔ دریں صورت اپنے نقطۂ نظر یا اپنی جہاں فہمی (World view) کا کسی دوسرے سے موازنہ کرنا دو مختلف قسم کی قیود کا موازنہ ہے اور بس!— بندشیں دونوں ہی ہیں۔ اس کی مثال بالکل وہی ہے کہ گویا جیل کا کوئی قیدی فرار ہونے کے لیے سرنگ کھودتا ہوا جیل کے احاطے میں ہی نکل آئے یا اسی جیل کی کسی اور

کوٹھڑی میں جا نکلے۔ اس طرح قید خانہ تو وہی رہے گا، ہاں! مقام بدل جائے گا اور یہ حالت برقرار رہے گی تا آنکہ قیدی کو یہ احساس نہ ہو جائے کہ آزادی کسی اور ہی جہت میں واقع ہے..... وقت میں سرنگ کھودنے سے بھی کبھی آزادی میسر آئی ہے! اس کی جہت بالکل الگ ہے۔

پچھلے لوگوں کی طرح ہم نے بھی انسانی امکانات کے انبار میں سے چند مخصوص مقاصد چن لیے ہیں اور ہر اس چیز کو پس پشت ڈال رکھا ہے جو ان سے لگا نہ کھاتی ہو۔ ان مقاصد کا تعین ان مفروضوں سے ہوتا ہے جن کو ہم مسلّمہ سمجھتے ہیں یا ان بدیہیات سے جن کو بلا دلیل مانتے ہیں یا ان اخلاقی لوازم (Moral Imperitives) سے جن کو ہم اپنا ثبوت آپ سمجھتے ہیں اور جن کے بارے میں ہمارے خیال میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ — ہم فکری مخلوق (Rational Creature) تو یقیناً ہیں مگر فکر انسانی خلا میں کام نہیں کرتی، نہ ہی وہ استدلال کے مقدمات اپنے جوہر سے پیدا کر سکتی ہے۔ اسے بہر حال کہیں سے اپنا آغاز کرنا ہے لہٰذا چند بنیادی قضیوں (Propositions) کو بدیہی ماننے کے بعد ہی انسانی دماغ کام کرنا شروع کر سکتا ہے اور..... فکر کا آغاز جس طرح صحیح مقدمات سے ہو سکتا ہے اس طرح بالکل غلط مقدمات پر بھی اس کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

مثلاً کسی تاریک جگہ میں کوئی آدمی رسی کے لچھے کو سانپ سمجھ لیتا ہے، اس کے بعد اس کی منطق بالکل درست اور اس کا رویہ قطعاً معقول ہوگا مگر رہے گا وہ غلطی پر۔ بنیادی مسلّمات سے ہی بعد میں آنے والی تمام باتوں کا تعین ہوا کرتا ہے۔

موجودہ دور کی بدیہیات اور مسلّمات کا ناقدانہ جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ایک بالکل مختلف تناظر کے خدوخال واضح کر دیے جائیں جس کے حوالے سے ہم آج کی بلا ثبوت مانی ہوئی مسلمہ باتوں کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہم میں سے کوئی بھی خود کو اپنے دور اور اپنے ماحول کے چنگل سے مکمل طور پر آزاد نہیں کروا سکتا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ہم سب کسی نہ کسی حد تک اپنے اپنے جنگل کی بیلوں میں جکڑے ہوئے ہیں اور بڑے مزے میں ہیں، یوں کہ گویا وہ بھی ہمارے نفوس کی توسیع ہیں اور ان کا ہمارے طرزِ احساس اور طرزِ فکر سے گہرا ربط ہے۔ ان علائق سے اپنے آپ کو بالکل توڑ لینا مشکل تو ضرور ہے مگر چونکہ ہم انسان ہیں، اس لیے ناممکن بھی نہیں۔ زمین و آسمان کے درمیان تمام جاندار مخلوقات اور ہر ارضی زیبائش میں سے صرف انسان ہی میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ خود کو اپنے زمانی سانچے سے کسی حد تک علیحدہ کر سکے۔

مگر آزاد ہونے کا مطلب خلا میں تیرنا نہیں ہے۔ ایک اخلاقی اور فکری ارض لاوارث..... (No man's land) میں تو کوئی بھی نہیں جی سکتا۔ اپنے زمانے کے لوگوں کے پائے استدلال پر ناقدانہ اور معروضی نگاہ ڈالنے کے لیے خود اپنے پیروں تلے پختہ زمین ہونی چاہیے۔ اس طرح اپنے زمانے کے روگ کی تشخیص کے لیے پہلے ہمارے پاس صحت کا ایک معیار بھی ہونا ضروری ہے۔

ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ معیاری (Normal) انسان کے اس تصور کے حوالے سے ہے جو ہمیشہ ہر زمانے اور ہر ثقافت میں موجود رہا۔ ہر ثقافت میں انسان کی فطرت اور اس کے مرتبے کا تصور ایک ہی رہا ہے، سوائے موجودہ مغربی تہذیب کے، اور وہ تصور تھا ایک دو پایہ مخلوق کا جو اپنی نیلی سبز دنیا میں اپنے رب کے روبرو ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ ایک ناقابل تغیر معیار کے حوالے سے اس تلاش کا آغاز ہوسکتا ہے کہ انسانوں کو زندگی میں کون کون سے اختیارات حاصل ہیں اور ان کے ذمے کیا فرائض ہیں؟

معاصر مغربی تہذیب کی خواہ تحسین کی جائے خواہ تنقیص، اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ تہذیب انسان کے ماضی قریب تک کے افکار و اعمال کے حوالے سے نہ صرف مختلف اور انوکھی ہے بلکہ غیر معمولی (Abnormal) بھی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ یہ غیر معمولی ہونا تاریکیوں سے نکل کر عقل کی روشنی میں آنے کی علامت ہے۔ دوسری طرف کچھ لوگوں کے خیال میں یہ ایک مہلک مرض کا آخری درجہ ہے تاہم اس سے کسی کو انکار نہیں کہ یہ مختلف اور اجنبی ہے، گویا کسی دوسرے سیارے کی مخلوق جو سطح ارض پر اتر کر قابض ہوگئی ہو۔ آج کے انسان کو ہم خواہ دیوتا کہیں، خواہ عفریت، مگر یہ حقیقت ہے کہ آج سے پہلے کبھی بھی اور کہیں بھی ایسی چیز موجود نہیں رہی۔ اگر ہم غیر معمولی (Abnormal) کی جگہ ''مسخ شدہ'' کا لفظ رکھ دیں تو معاملے کو سمجھنے میں غالباً کچھ اور آسانی ہوگی۔ مسخ شدہ (Deformed) کے معنی یہاں ہوں گے ''اس کی طرف سے ہمیشہ کے لیے دھتکارا ہوا جس کا حُبِّ جمال ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسے بگاڑ سے نفرت ہے۔''[1]

اس پر طرّہ یہ کہ یہ مسخ شدہ مخلوق اس گمان میں ہے کہ انسان سے مراد ہمیشہ سے صرف وہی کچھ ہے جو وہ خود ہے اور یہ انسانی فطرت کی تعریف اپنی فطرت، اپنی کمزوریوں اور اپنے سیئات کے

1- *Centuries of Meditation*: Thomas Traherne, II:4.

حوالے سے متعین کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر کبھی اسے یہ احساس ہو بھی جائے کہ انسانی حالات اور رفتارِ زمانہ میں خاصی گڑبڑ ہے، بہت ابتری ہے، تو بھی اس کا تجزیہ یہ ارتقائی آدرش کی روشنی میں کرتی ہے۔ اس مخلوق کو یہ سمجھانا محال ہے کہ یہ آدرش اور مقاصد ہی سرے سے غلط ہیں اور ہماری دشواریاں اور دکھ منزل کے راستے میں حائل رکاوٹوں کے پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ ہمارا ابتدائی انتخابِ منزل ہی غلط ہوا ہے۔ اگر کسی طرح اس مخلوق کو کچھ سمجھا بھی دیا جائے تو پھر اس کا ردعمل بلاسوچے سمجھے کے تباہ کن اقدامات میں ظاہر ہوتا ہے۔ شاید لوگوں کا خیال ہے کہ مسائل کو پلک جھپکتے، جھٹ پٹ حل کیا جاسکتا ہے۔ یہ بات ان کی عقل میں نہیں آتی کہ اس قسم کے حل..... انقلاب، اصلاح، نئی قانون سازی، مزید تکنیکی ترقی اور زمین کے ذخائر کے وسیع تر استحصال سے زیادہ تر مزید بے لگام شرہی کی پرورش ہوتی ہے۔ اگر وہ یہ تسلیم کرلیں تو شاید ذرا سکون سے سوچنے، دیکھنے، سننے پر آمادہ ہوسکیں بلکہ شاید پرچھائیوں کے ساتھ رہنا سیکھ لیں۔ پرچھائیاں، جن کا دن کی روشنی سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مختصر یہ کہ نسل انسانی کے مستقبل کے بارے میں غیر معمولی تشویش جو آج کل کے لوگوں کے دماغ میں بھری ہوئی ہے وہ ایک بالکل جدید شے ہے۔ رجائیت کے بغیر بھی زندگی ممکن ہے اور اچھی خاصی ممکن ہے۔ اسی طرح ہم تشائم پرستوں (Pessimists) کی قنوطیت کے بغیر بھی گزر کر سکتے ہیں جن میں سے بیشتر اصل میں صرف مایوس رجائی (Optimists) ہوتے ہیں۔ ان جذباتی بلبلوں کی ہمیں موجودہ حالات میں کوئی ضرورت نہیں، نہ ہی اسلامی نقطۂ نگاہ سے ان میں کوئی معنی ہیں۔ مسلمان یہ بات آسانی سے نہیں بھولتے کہ بحیثیت مرد و زن ہم سب کو ایک دن یقیناً مرنا ہے اور معاشرے، تہذیبیں اور دنیائیں بھی ہماری طرح فانی ہیں: ''کل من علیھا فان۔ ویبقی وجہ ربك ذوالجلال والاکرام۔''[1]

ایک اعتبار سے ہمیں اتنا جاننا بہت ہے اور باشعور آدمی کا رویہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے جیسا ایک ڈرامے کے اداکار کا جسے ذرا پرواہ نہ ہو کہ اس ڈرامے کے ختم ہونے کے بعد تھیٹر کا کیا ہوگا۔ گو کبھی کبھی وہ بطور فیشن کے انسانی مستقبل کے بارے میں تشویش کا دکھاوا ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ مسلمانوں کا تو خیر ہے ہی، قدیم عیسائیوں کا بھی عقیدہ یہی تھا کہ دنیا اور اہل دنیا خدا کے دست قدرت میں ہیں، جس کی مشیت بدل نہیں سکتی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ ہمیں ایک ہزار برس تک جینے

۱- قرآن کریم: ۵۵/۲۷

کی مہلت دے، سو برس کی مہلت دے یا کل کا دن ہمارے لیے آخری ہو، کیونکہ تقدیر سے کسی کو مفر نہیں اور بالآخر سب ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ ابھی اور یہیں وہ فرض منصبی پورا کریں جس کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں۔

فی الوقت ہماری تحریر کا تعلق اس سے ہے کہ انسانی فطرت کے روایتی تصور کے حوالے سے انسان ہونے کے معنی کیا ہیں؟

انسانی فطرت کے روایتی تصور اور معاصر تصور میں، جو موجودہ انسان کے آئینہ خیال میں اس کا اپنا عکس ہے، کوئی قدرِ مشترک نہیں۔ موجودہ تصور انسان میں انسان کو ایک ایسا چالاک جانور سمجھا گیا ہے جو زمین کی دولت سمیٹنے کے لیے پیدا ہوا ہے خواہ اس سے ذاتی لذت اندوزی مقصود ہو یا معاشرے کی خدمت حتیٰ کہ اسی کارِ عبث میں اس کے شرارۂ حیات کی چمک ختم ہو جاتی ہے اور وہ قبر کی تاریکی میں گم ہو جاتا ہے۔ روایتی تصور کے مطابق انسان کا مقصد یہ ہے کہ ایک علامت بن کر رہے۔ النور کی ایک علامت۔ نہ کہ ایک بے ثبات اور ناپائیدار وجود کی طرح ــــ سورج کی شعاع کے راستے میں چند لمحوں کے لیے آنے والے خاکی ذرات میں سے ایک ــــ بطور علامت زندہ رہنا ہی ایک لحاظ سے انسان کی حقیقی (as such) نمائندگی کرنا ہے۔ اس طرح انسان کے منصب کی رفعت ایک طرف تو آسمان کو چھونے لگتی ہے اور دوسری طرف اس کی وسعت بعید ترین اُفق تک پھیل جاتی ہے۔

مگر چونکہ انسان ایک ادھوری اور کسری (Fragmentry) مخلوق ہے۔ اسے کمال کی تلاش رہتی ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو فی الحقیقت حاصل کر سکے۔ مسلمانوں کے لیے یہ تکمیل اسوۂ رسول ﷺ پر عمل کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے متوازی عیسائیوں کے یہاں نظریۂ اتباعِ مسیح (Imitation of the Christ) ہے۔ اس کے متبادلات دوسرے مذاہب میں بھی ہیں لیکن کسی جگہ بھی انسان کی صرف شخصی صلاحیتوں کو کافی نہیں سمجھا گیا۔ ہر روایت میں اس ادھوری مخلوق کو جو صرف اپنے ہی آلات پر اور اپنی ہی تدابیر پر بھروسہ رکھتی ہو، جس کے سامنے کوئی قابل تقلید نمونہ نہ ہو ــــ یعنی اپنے آقا سے محروم آدمی ــــ کو ایک آوارہ کتا سمجھا گیا ہے جو انسانی آبادیوں کے باہر اپنی غذا کے لیے مارا مارا پھر رہا ہو۔

ناول، ڈرامے اور فلم کی شکل میں ہم اپنے آپ کو جو آئینے دکھا رہے ہیں ان میں انسان کا یہی کردار جھلک رہا ہے۔ ایک آوارہ کتے کا کردار ــــ اور یہ کردار ایک دور افتادہ، روشنی سے محروم ویرانے میں ادا کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ ہمارا موجودہ ماحول اس دنیا سے جس میں پچھلے زمانوں

کے لوگ بستے تھے، اتنا دور ہو چکا ہے کہ اس فاصلے کو ناپنے کا ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں رہا۔ اس کا بُعد ہم صرف چند تمثیلوں کے ذریعے بیان کر سکتے ہیں جو شاید آپ کو نری خیال آرائی معلوم ہوں۔

موسم بہار کے ایک منظر کا تصور کیجیے جو اگرچہ ہماری محدود نظر کی وجہ سے محدود لگتا ہے مگر حقیقتاً غیر محدود ہے۔ جہاں تک ہماری نظر کام کر رہی ہے، پہاڑ، وادیاں، جنگل اور دریا پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے اختراع پسند دماغ میں جو کچھ آ سکے، فرض کر لیجیے۔ اب فرض کیجیے کہ ان لامحدود وسعتوں میں کسی جگہ ایک بچہ ہوا میں بلبلے اڑا رہا ہے جو سورج کی روشنی میں چمکتے زمین و آسمان کے بیچ تیر رہے ہیں۔ اب اپنی کائنات کو ایسا ہی ایک بلبلہ فرض کر لیجیے جس میں ہماری دنیا یعنی زمین اپنے تمام مشمولات سمیت اور چاند ستارے اور سورج سب شامل ہیں۔ ــــ ایک تنہا حباب ــــ اس بچے کے بلبلوں کی طرح یہ بھی ہمارے مفروضہ منظر کا حصہ ہے۔ یہ موجود تو بہر حال ہے مگر ہے بہت ہی چھوٹا سا اور چند لمحوں میں اسے ختم ہو جانا ہے۔

یہ ایک طریقہ ہے اس تعلق کو بیان کرنے کا جو ہماری دنیا کا اس عالم سے ہے جو اس سے ورا ہے۔ یہی روایتی تصور کائنات ہے۔ چلیے اس تمثیل کو آگے بڑھائیں۔

بلبلے کی سطح باہر کے منظر کو منعکس بھی کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ شفاف بھی ہے کہ اس کے آر پار نظر آتا ہے جو لوگ اس بلبلے کے اندر رہتے ہیں وہ باہر کے منظر سے کئی مختلف انداز میں آگاہ ہو سکتے ہیں۔ جن کی نظر کمزور یا غیر تربیت یافتہ ہوگی وہ بیرونی منظر کے وجود کو قیاس کریں گے اور تیز نظر والوں کے بتائے کو مان کر اس پر ایمان لے آئیں گے۔ دوسرے چند لوگ جو بلبلے پر خارجی منظر کے انعکاس کا ادراک کر لیں گے ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ اس کے اندر عکس سے زیادہ کچھ نہیں اور اس کی اپنی بالذات ہستی کچھ نہیں۔ ایک تیسری قسم کے تھوڑے سے لوگ وہ ہوں گے جو ایک معجزۂ نظر کے طور پر اس بلبلے کی شفاف دیوار کی حقیقت پہچان لیں گے۔ ان کی نگاہ اس باریک جھلی کے پار بھی دیکھ سکے گی جو دوسروں کے لیے دھندلی ہے اور وہ ایمان کے علاوہ مشاہدہ بھی کر رہے ہوں گے۔

یہ تینوں قسم کے لوگ ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہوتے ہیں مگر ان کا باہمی اختلاف اس اختلاف کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو ان تینوں کو ان لوگوں سے جدا کرتا ہے جو بلبلے ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ اس ننھے سے دائرے کے باہر بھی کوئی حقیقت

ہے۔ اہل ایمان اور اہل نظر (اہل کشف) کے لیے جو حق ہے وہ ان کے نزدیک فریب ہے۔ ان دونوں کے درمیان کوئی مشترک زبان موجود نہیں۔ تجربات میں آنے والی اشیا تک کو دونوں نے جو نام دے رکھے ہیں، ان سے ایک کی مراد کچھ ہے اور دوسرے کی کچھ۔ جو آدمی نابینا ہو وہ تو پھر بھی دوسروں کی بتائی ہوئی دنیا پر یقین رکھتا ہے، خواہ اس کا تخیل کر سکے یا نہ کر سکے مگر یہ دل کے اندھے تو نظر کے وجود ہی سے منکر ہیں۔

اسلام کے حوالے سے ماننے اور نہ ماننے والوں کا یہ فرق وہ سب سے بنیادی فرق ہے جو انسانوں کے درمیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کے سامنے طبقاتی یا نسلی بلکہ مزاج اور کردار کے اختلاف کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ یہ نہ ماننے والے صرف وہ نہیں ہیں جو کسی خاص عقیدے میں شریک ہونے سے گریز کرتے ہیں بلکہ یہ ''کافرون'' ہیں جو حق کو چھپاتے ہیں۔ جنھیں پردہ فریب نے ڈھانپ رکھا ہے اور جن پر یہ دھوکا ایسا مسلط ہے کہ انھیں حقیقت کے حلقۂ اثر میں آنے نہیں دیتا۔ جو نورِ حق سے اس طرح کٹے ہوئے ہیں گویا ''وجوھھم مسودہ۔''

اسی طرح ہندومت میں بھی جاہل اور عارف میں واضح تمیز کی گئی ہے۔ زمانۂ جدید میں اپنا ایمان برباد کر لینے سے پہلے تک عیسائی بھی ''نہ ماننے والوں'' اور مبتدعین کو مار ڈالنا زیادہ مناسب سمجھتے تھے بہ نسبت اس کے کہ ان کے اندھے پن کی چھوت دوسروں کو بھی لگ جائے۔ یہ سخت گیری خواہ آج کے لوگوں کو کتنی ہی نفرت انگیز کیوں نہ معلوم ہوتی ہو (کیونکہ ان کے لیے اس بلبلے کے باہر کی ہر چیز یا تو نری من گھڑت ہے یا نیک تمنا) اس سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل غلط ہوگا کہ قدیم عیسائی انسانی ہمدردی سے عاری تھے۔ ہاں انھیں ایسے لوگوں کی جاں بخشی میں کوئی بھلائی یا نیکی نظر نہیں آتی تھی جو سرچشمۂ خیر ہی میں زہر گھول رہے ہوں اور اپنے ہمسایوں اور اقربا کے نفوس خطرے میں ڈال رہے ہوں۔ موجودہ صدی میں انسانوں کی جتنی کثیر تعداد محض سیاسی آرا اور لادینی نظریات کے نام پر موت کے گھاٹ اتار دی گئی ہے، اس کے بعد کسی کا اپنے آپ کو راست باز سمجھنے یا بدعت اور کفر کے استیصال کے لیے ہونے والی مذہبی جنگوں اور ''مذہبی تشدد'' (fanatacism) پر نظرِ حقارت ڈالنے کا کیا منہ رہ جاتا ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ ہے جو ہماری معلومہ دنیا اور اس سے سوا اور ورا عالم میں اختلافِ نسبت کو ظاہر کرتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مجھے قسم ہے اپنے رب کی کہ یہ دنیا آخرت کے مقابلے میں ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی سمندر میں

اپنی ایک انگلی ڈبو کر نکالے اور اس پر جو پانی لگا ہو اس کا مقابلہ سمندر سے کیا جائے۔

ایک چھوٹے سے قطرے اور سمندر کے درمیان کوئی مشترک پیمانہ ممکن نہیں۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ پچھلے زمانے کا ہر ''ماننے والا'' ہندو، مسلم یا عیسائی اپنے تجربے میں آنے والی روزمرہ کی دنیا اور اس پر محیط بحرِ حقیقت کے درمیان اس عدم تناسب سے واقف تھا۔ نیکو کار بننے کے لیے ایسی آگاہی کی ضرورت بھی نہیں۔ کسی مذہبی عقیدے کی اساسی صداقت کا فیصلہ اس کے ماننے والوں کے درمیان رائے شماری سے نہیں ہوا کرتا۔ جس لمحے ہم ایک وحی پر مبنی دین کی بات کرتے ہیں، جونہی ہم اللہ یا ماورا الطبیعی کا ذکر کرتے ہیں تو یہ عدمِ تناسب اس میں مضمر اور محذوف ہوتا ہے اور ہر قول و فکر میں اس کا رنگ جھلکتا ہے۔ اسے خارج کر دیجیے تو وہ کمانی ہی غائب ہو جائے گی جس پر سارا مذہبی ڈھانچہ حرکت کرتا ہے۔ اس کے بغیر دین لے دے کے بس ایک جذباتی مثالیت پرستی (Idealism) بن کر رہ جاتا ہے یا پھر خیالی پلاؤ۔ ایک دنیا زدہ یا دنیا تک محدود دین، جس کی وہی سطح ہوتی ہے جو کسی بھی لادین نظریے کی ہے۔

تاریخ کے ایک ایسے دور میں جب ''معلومات'' کا بت بنا کر پوجا جاتا ہو اور لوگ باگ گزشتہ زمانوں کی جہالت کی تضحیک و استہزا کرتے نہ تھکتے ہوں، ایک ایسے موضوع کے بارے میں حیران کن جہالت پائی جاتی ہے جو چند نسلیں پہلے تک سب سے اہم موضوع سمجھا جاتا تھا اور دنیا کی کم از کم نصف سے زیادہ آبادی اسے آج بھی اتنا ہی اہم سمجھتی ہے۔ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ مغربی تہذیب سے متاثر طبقہ کیسی محدود زندگی گزارتا ہے۔ ''تعلیم یافتہ'' (مراد ہے صرف مغربی تعلیم یافتہ) لوگوں میں بحیثیت مجموعی دین اور اس کی ماورا الطبیعیاتی اساس کے بارے میں ہی نہیں بلکہ (اگر وہ کسی دین سے وابستہ ہونا گوارا کریں تو) ان کے اپنے دین کی ابتدائی باتوں کے بارے میں ایسی گہری اور اس مقدار میں جہالت پائی جاتی ہے کہ اگر یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ دین کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا افریقہ کے بونے جوہری طبیعیات (Nuclear physics) کے بارے میں۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ تعلیم یافتہ لوگ اپنے زور جہالت کے بل پر دین کے بارے میں لگی بندھی، قطعی اور ادعائی رائے زنی میں ذرا ہچکچاہٹ نہیں محسوس کرتے۔

ایک بات کی وضاحت ہم کرتے چلیں کہ اس کتاب میں آئندہ جو کچھ ہم پیش کریں گے اس میں ''فکر جدید'' کے بہت سے حصے کو ہم نے درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ ہمارے خیال میں وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کے بارے میں رائے ظاہر کرنے میں وقت ضائع کیا جائے لہٰذا اس فکر کے حاملین کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ہم نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہی

ہے کہ ان ''مفکرین'' نے بھی اس ساری فکر کو یونہی خارج از بحث کر دیا تھا جسے ابھی کچھ عرصہ پہلے تک، صدیوں سے دنیا بھر کی اشرف، عاقل اور زیرک ترین شخصیات نے تفکر انسانی کا جواز اور اس کا وقار قرار دیا تھا۔ جدید مفکرین کے خیال میں اگر انسان دور جدید کے آغاز سے پہلے تک یعنی انسانیتِ ارضی کے سینکڑوں گزرے ہوئے برسوں میں لایعنی، احمقانہ اور جاہلانہ انداز میں سوچتا آیا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اب بھی اس کے حمق و جہل کے امکانات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

انسان کے ماضی کی ساری داستان ایک عروج سے زوال کی داستان ہے۔ روحانیت خالص سے کٹ کر بڑھتی ہوئی مادیت کی طرف پیش قدمی کا رزمیہ ہے۔ اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ میں تنزل ہی واقع ہوا ہے، ارتقا نہیں۔ لہٰذا اگر وہ صدیوں سے احمق مانا جائے تو اب بھی احمق رہے گا اور اگر اس کے پاس آج کچھ سرمایۂ دانش ہے تو گزرے ہوئے کل میں اس سے بہتر تھا۔ ماضی کے افکار کو رد کرنے کے منطقی نتائج بڑے سنگین ہیں۔ چونکہ جدید مفکرین نے اپنی ذہنی ابتری کو چھپانے کے لیے تمام قدیم اہل دانش کی بات سننے سے انکار کر دیا تھا اس لیے ہم ان مفکرین کی بات سننے پر تیار نہیں، جو دوسروں کی سنی ان سنی کرتے رہے، ان کی بھی نہیں سنی جائے گی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ علم نظری (Theoretical knowledge) ایمان لانے کے لیے لازمی ہے اور انسان اللہ تعالیٰ سے اس وقت تک محبت نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ فیلسوف نہ ہو، قطعاً نہیں۔ مگر پچھلے وقتوں کے سیدھے سادے ایمان والے جو بہت تھوڑی معلومات مگر بہت راسخ ایمان رکھتے تھے آج کی دنیا میں نہیں جی سکتے جہاں ہر لمحہ ان پر بے اعتقادی اور کفر کے دلائل کی چاند ماری ہوتی رہتی ہے۔ آج سیلاب زمانہ کے سامنے اپنے عقائد پر جمے رہنے کے لیے اعتقادات کا نظری علم لازم ہو گیا ہے۔

آج سے سو برس پیشتر ایک آدمی اچھا عیسائی ہو سکتا تھا اور رہ سکتا تھا خواہ اس نے سینٹ آگسٹائن اور اکویناس کا نام بھی نہ سنا ہوتا۔ اس وقت نرا ایمان کافی تھا، کیونکہ اس کی حفاظت ہوتی رہتی تھی۔ آج کا مسلمان اگر ان عقائد کے بارے میں تفصیلی اور نظری علم نہیں رکھتا جن پر اس کا ایمان ہے تو اس کے ایمان کی سلامتی ہر دم خطرے میں ہے۔ ہاں کسی شخص کو فطرتاً سادگی کا ایک ناقابل تسخیر حصار میسر ہو تو اور بات ہے۔

بات صرف مخالفانہ دلائل کی دھمکیوں اور ان کے جواب تک ہی محدود نہیں ہے۔ ایک اور چیز، جس کی تعریف اور جس کا تعین گو مشکل ہے، زیادہ قوی ہے اور سارے میں چھائی ہوئی ہے۔ وہ ہے ایک عمومی

خیال، ایک رائے عامہ بلکہ ایک خاموش اتفاق رائے۔ جیسا کہ شیخ عیسیٰ نورالدین احمد نے کہا ہے:

جب لوگ خدا یا عالم قدس سے جان چھڑانا چاہتے ہیں تو اس کا منطقی طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ایسی فضا اور ماحول پیدا کرنا شروع کر دیا جاتا ہے جس میں روحانی چیزیں اوپری اور اُنمل معلوم ہونے لگتی ہیں۔ خدا کے غیر حقیقی ہونے کے اعلان میں کامیاب ہونے کے لیے انھیں انسان کے گرد ایک جعلی حقیقت تعمیر کرنا ہوتی ہے ایسی حقیقت جو لازماً غیر انسانی ہوتی ہے کیونکہ صرف غیر انسانی حقیقت ہی خدا کو خارج کر سکتی ہے اس کام میں تخیل کی جعل سازی اور نتیجتاً اس کی تباہی کا بھی عمل دخل ہے۔[1]

جس طرح ہر عہد میں اس کے مفروضوں کے اپنے مخصوص سانچے اور نمونے ہوتے ہیں اسی طرح ہر عہد میں کچھ نظریات اپنی ماہیت کے اعتبار سے ہی اس عہد والوں کے بظاہر بعید از قیاس ہو جاتے ہیں۔ ان کے استبعاد (Improbability) کو کسی دلیل سے ثابت نہیں کیا جاتا۔ پھر چونکہ ہر عہد کی پیداوار ــــ اس کا ادب اور فن تعمیر، انسانی ماحول یعنی انسانوں کے اعمال اور مصنوعات ــــ دونوں معاصر مفروضوں کے پرتو بھی ہوتے ہیں اور ان کو تقویت بھی دیتے ہیں لہٰذا یہ بعید از قیاس جلد ہی ناممکن الخیال بن جاتے ہیں۔

اس کے بعد ماضی کی چند یادگاروں اور طبعی ماحول (Nature) کے علاوہ ہر چیز ان مفروضوں کی تائید کرنے لگتی ہے اور تشکیک تو دور کی بات ہے ان مفروضوں کے بارے میں ناقدانہ انداز فکر اختیار کرنے کے لیے بھی جبری شعوری کاوش کرنا پڑتی ہے۔ گویا کہ انسانوں اور ان کے ماحول (Immediate surroundings) کے مابین ایک باہمی عمل نفوذ (Osmosis) واقع ہو گیا ہو جس میں خارج اپنے داخل (انسان) کو منعکس کرے اور اس کے زیر اثر متشکل ہو جبکہ داخل اپنے خارج (ماحول) کے قالب میں ڈھل جائے۔ مذہبی نقطۂ نظر اپنے تمام تلازمات اور اطلاقات سمیت، جس میں احترام و ہیبت ماورا اور شعور قدس (Sense of the Sacred) بھی شامل ہے، ایک عام آدمی کے لیے طبعاً صرف اس وقت ممکن ہے جب وہ ایک ایسے ماحول میں رہتا ہو جس میں نورِ قدسی کچھ نہ کچھ منعکس ضرور ہوتا ہو اور اس نور کی ایک آدھ کرن اس کے حواس کو بھی میسر آتی ہو۔ ایک مکمل

۱- *Understanding Islam*: Frithj of Schuon, p.37.

طور پر دھندلے ماحول میں عام آدمی کے لیے ہمارے بلبلے کے باہر کے منظر کا تصور کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور وجودِ باری خود استبعادِ عظیم (Great Improbability) بن جاتا ہے۔

ہمارے ہاں کے وہ نیک مسلمان جن کو ابھی جدیدیت کی ہوا نہیں لگی، ان کو ''نہ ماننے والوں'' (کفار زمانۂ حاضر) کو سمجھنے اور ان کو اپنے جیسی فطرت رکھنے والا گردانے میں جو دشواری خاص طور پر درپیش رہتی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ان مسلمانوں کے لیے اپنے دین کی صداقت (توحید الٰہی اور اس کے تمام اطلاقات و مضمرات) ایسے حاوی انداز میں بدیہی اور اپنا ثبوت آپ ہے کہ ان کے نزدیک اس کا انکار ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص تپتے صحرا میں کھڑا ہو کر سورج کے وجود سے انکار کر دے۔ ان ''نہ ماننے والوں'' کے خیالات کے کسی طرح کے احترام کا خیال ان کو احمقانہ بلکہ فاسقانہ معلوم ہوگا۔

دوسری طرف دنیائے جدید میں اکثر لوگوں کو اس ''ایمان قاہر'' (شیخ عیسیٰ نورالدین احمد کے الفاظ میں) (Terrifying faith) کو سمجھنے میں جس دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ روزمرہ زندگی کی ہمہ گیر اور بلاشرکت غیرے حقیقت ان کو اتنی ہی بدیہی اور ناقابل اعتراض لگتی ہے جتنی کہ مسلمانوں کو توحید۔ دونوں کے لیے ایسی سامنے کی بات میں شک و شبہ تقریباً ناممکن ہے۔ اس سے آپ ایک خاص رائے سے پیدا شدہ فضا اور ماحول کی تائید اور قوت کا اندازہ کر لیجیے۔

شاید کسی کو یہ اعتراض سوجھے کہ مغربی یورپ اور امریکہ تو اب بھی عمومی طور پر ''عیسائی'' کہلاتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ قدیم عیسائی یعنی عیسوی تاریخ کی پہلی پندرہ صدیوں کے لوگ اگر آج ہوتے، تو کیا ان کو عیسائی مان لیتے؟ اس لیے کہ پرانے عیسائیوں اور روایتی مسلمانوں بلکہ کسی حد تک آج کے بدھ مت والوں اور ہندوؤں کے لیے بھی انسانی زندگی میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو ہر چیز پر ترجیح رکھتی ہیں اور مقدم ہیں۔ پھر ان ترجیحات میں ایک سب سے افضل ہے۔ ایک طرف ''المطلق'' (Absolute) ہے اور دوسری طرف اضافی اور اعتباری (Relative)۔ بلحاظ اہمیت اعتباری کو مطلق سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اس قسم کا کوئی شعورِ ترجیحات ہمارے زمانے کی انسانیت پرست اخلاقیات (Humanistic Morality) کے پاس رہنمائی کے لیے موجود نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے ان معاصرین کے افکار عالیہ بھی اس خیال سے کبھی متصادم نہیں ہوتے جو ایک آرام دہ حیات بعد الموت پر ایک مبہم سا اعتقاد رکھتے ہیں جو ہر اس شخص کو حاصل ہوگی جو شائستگیٔ آداب کا حامل ہو۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا آج کل دو متبائن اور منافی رویوں یعنی کفر و ایمان کے درمیان حد فاصل دھندلی ہوگئی ہے۔ ایمان یا کفر و ایمان دونوں کو ان کے منطقی نتائج تک لے جانے کا حوصلہ کسی میں نہیں۔ اس وقت ہمارے ہاں ایک اعتقادی جھٹ پٹے کا سماں ہے۔ لوگ بس زمانے کی رو میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ انھیں یہ تو خیال ہے کہ اس صورت حال کے بعد ''کچھ'' ہے ضرور مگر انھیں شک ہے کہ کسی کو بھی اس ''کچھ'' کا فی الحقیقت علم نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ان عظیم آوازوں سے بھی بے خبر ہیں جن کا سننا آج بھی ممکن ہے اور جو ان کو اس ''کچھ'' کا ہو بہو حال بتا رہی ہیں اور ان سے مطالبہ کر رہی ہیں کہ وہ ان کی بات اس طرح سنیں جیسے مہلک خطرے کا شکار، موت کے پنجے میں گرفتار ایک آدمی اپنے نجات دہندہ کی سنتا ہے۔ یہ نیم دروں نیم بروں قسم کے لوگ ایک ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جس کی ماہیت ظلمت ہے اور جس میں ان کے چھوٹے سے نور کے ہالے کے سوا سب کچھ غیر حقیقی لگتا ہے۔ اگر یہ کبھی حقیقت الٰہیہ کے بارے میں سوچتے بھی ہیں تو وہ ان کو خیالی، وحشت انگیز اور گھاٹے کا سودا معلوم ہوتا ہے۔ صحرا کے آفتاب کا جھلسانا اور چندھیانا ختم ہو چکا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر ہمارے لیے یہ بات ذرا بھی حیران کن نہ ہوگی اگر مذہب اس دشمن ماحول میں باقی نہ رہ سکے اور جو بچا کھچا رہ بھی جائے وہ بھی اپنی عمودی جہت سے محروم و منقطع، دنیاویت میں گھرا ہوا ہو۔ یہاں دنیاویت کا مطلب وہ نہیں جو عموماً سننے میں آتا ہے یعنی عورت، شراب اور موسیقی، (یا ان کے مترادفات اور متبادلات) کیونکہ یقینِ مذہبی کے سامنے ان تینوں چیزوں کو کبھی کوئی خاص قوت حاصل نہیں رہی۔ دنیاویت سے ہماری مراد اس دنیا کی چیزوں سے ایسا لگاؤ اور تعلق ہے جو کسی اور شے کی گنجائش نہ رہنے دے۔

یہ تعلق اس لیے بھی زیادہ مرغوب ہو گیا ہے کہ اسے کوئی بڑی چیز بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ سرچشمۂ خیر حبِّ الٰہی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک ''سماجی شعور'' یا ''سماج کا ضمیر'' اس محبت کا مناسب بدل ہو سکتا ہے۔

جدیدیت کا شکار ہونے والوں کی جدید اخلاقیات جو معاشی (اقتصادی) اور معاشرتی (سماجی) فوائد کو ہر دوسری چیز پر فوقیت دیتی ہے، ایمان والوں کی نظر میں بالکل مردود ہے اور اس تردید کی وجہ یہی ہے کہ اس اخلاقیات نے نہ ماننے والوں (کفار) کا پیمانہ ترجیح و تفضیل اپنا رکھا ہے اور یہ ایک عمل تغیر کی کارفرمائی سے مغلوب و مطیع ہو کر ان غیر متغیر اصولوں کو چھوڑ چکی ہے جن کے

نگران، مذہب اور اس کے ادارے (علوم وفنون و رجال) ہیں۔ مخالفان دین کو یہ صورت حال بہت موافق نظر آتی ہے۔ جب تک عقائد کی بات نہ ہو وہ خاموش رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کا سابقہ کسی صحیح اور ٹھیٹھ عالم دین سے پڑتا ہے تو ایسے گھبراتے ہیں جیسے نالی کے کیڑے کو عطار کی دکان میں رکھ دیا گیا ہو۔ ہاں عالم دین کے بھیس میں کسی بھی سماجی کارکن کا ہاتھ بٹانے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں جبکہ سچے لوگ جو جھینپتے ہوئے ایمان، امید اور حقیقی محبت کا مطالبہ کرتے ہیں انھیں اپنے ہی جیسے ڈرے، دبکے اور بے یقین لوگوں سے کوئی تسلی نہیں مل سکتی۔ انھیں ایک ایسا ''نرم وخوش گوار'' عقائد سے عاری دین پیش کیا جارہا ہے جو اپنے آپ کو معاصر مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھال چکا ہے۔ وہ تہذیب جس کے تمام مفروضوں، ساری اقدار اور منطق کے سارے مآخذ سرے سے غیر قدسی اور دنیوی (Profane) تھے، ان مآخذ میں سرفہرست انسانیت پرستی (Humanism) خرد پرستی (Rationalism) نشاۃ ثانیہ کے دور کا تطاول (Titanic Self-assertion) اور جعلی بلند بانگ خود اعتمادی تھی۔ یا اگر اور پیچھے جایئے تو اس تہذیب کا منہج دو قدیم تہذیبوں یعنی یونان و روم کے وہ گھٹیا ترین اوصاف ہیں جو انھوں نے کلاسیکی ورثہ کی شکل میں اس وقت مغرب کے حوالے کیے جب وہ دونوں انسانیت کے معیار (Norm) اور دوسری تہذیبوں کے حوالے سے خود ہی زوال پذیر اور انحطاط کا شکار ہو چکی تھیں۔ اس کلاسیکی ورثہ پر عیسائیت بھی صرف عارضی طور پر ہی غالب آسکی تھی۔

کتنے ہی خرابے آج ان نیک نیتوں کی شہادت دے رہے ہیں جو بھٹک گئیں۔ ایسے ارادوں کی شہادت جن کو نور دانش کی کرن میسر نہ ہوئی۔ لوگوں کو دین سکھانا اچھی بات سہی، ضروری بھی سہی مگر آج کی صورت حال ایسی نہیں کہ مجوزہ مقصد کو کسی بھی منہاج وصول کا جواز قرار دے لیا جائے۔ کیونکہ جوں جوں لوگ حق سے دور ہٹتے جارہے ہیں یہ خواہش زور پکڑتی جارہی ہے کہ دین میں مناسب قطع و برید کی جائے اور اس کے وہ پہلو یا وہ عناصر جو لوگوں کے حلق سے آسانی سے نہیں اترتے ان پر بے ضرر سا ملمع کر دیا جائے یا ان کی تاویل کر دی جائے یا مختصراً یہ کہ مصالحت کے لائحہ عمل کو ملاوٹ کی پالیسی بنا دیا جائے۔ اس طرح یہ توقع کی جاتی ہے کہ عام آدمی مذہب کو اپنی مصروف زندگی کے ایک گوشے میں جگہ دے دے گا اور ساتھ ہی ساتھ اُسے اپنے طرز زندگی میں کوئی تبدیلی بھی نہیں لانی پڑے گی نہ ہی پریشان کن خیالات (آخرت، جزا و سزا) سے الجھنا پڑے گا۔ یہ

بالکل بیہودہ اور موہوم امید ہے۔ اس طریقہ کار کا انجام یہی ہوگا بلکہ بہت سے مقامات پر ہو چلا ہے کہ دین کی بات سکھانے والا اس خوانچہ فروش کی طرح ہو جائے گا جو بھرے بازار میں سڑک کے کنارے کھڑا اپنے مال کی قیمت گھٹاتے گھٹاتے اب اسے مفت بانٹنے پر آمادہ ہو چکا ہے۔

آخرت، حساب کتاب اور جزا و سزا ایک دیومالا ہے، جہنم ایک خبیث واہمہ ہے، عبادت اور دعا شائستہ رویے سے بھی فروتر اور بے اہمیت ہے اور آخر میں خود وجود الٰہی لایعنی اور غیر ضروری ہے۔..... مگر اس کے باوجود لوگ اس بھلے مانس خوانچے والے کو نظر انداز کرنے پر رسمی سا افسوس کرتے ہوئے اپنے دوسرے اہم کاموں کی طرف متوجہ ہو جائیں گے جو ان کی راہ تک رہے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ لوگوں کے یہ اہم کام جن کے لیے وہ ہر چیز نظر انداز کیے ہوئے ہیں خود ان کے نزدیک ریگ رواں بلکہ دلدل ہیں جس میں وہ دھنستے جا رہے ہیں۔ اگر ان کو اس کا حقیقی متبادل (یعنی دین اپنی اصلی شکل میں نہ کہ حیلۂ پرویزی کا شکار) پیش کیا جائے جو ابتدائے زمان سے ایک چٹان کی طرح اٹل ہے تو شاید وہ اس کے لیے بھاری قیمت ادا کرنے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے پر بھی تیار ہو جائیں۔

اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اگر حقیقی دین سکھانے والا ان سے منہ موڑ کر صرف اور صرف آفتاب الٰہی کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اسی سے لو لگائے، اسی پر نگاہ جمائے رکھے تو لوگ از خود اس کی پیروی کرنے لگیں گے اور ہاتھ باندھے، اپنی فکروں اور مشکلات کو فراموش کیے ہوئے اس رخ پر دیکھنے لگیں گے جدھر وہ دیکھ رہا ہے۔ ایک لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کا بنیادی حکم یہ نہیں ہے کہ ''یہ کرو، وہ نہ کرو''..... بلکہ محض ''دیکھو''۔ باقی سب کچھ خود بخود ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ اسی کا تابع ہے۔

موجودہ زمانے میں چونکہ تقریباً ہر قول و فکر کی تہ میں عدم ایمان کام کر رہا ہے لہٰذا دنیائے جدید پر ایک ایمان والے کی تنقید لازماً انتہائی ہوگی۔ کوڑھی کی مشاطگی کوئی نہیں کرتا۔ مگر انتہا پسند تنقید کا بھی کوئی مقصد ہونا چاہیے اور چونکہ دنیا کی تقدیر ہمارے کسی بھی اقدام سے نہیں بدل سکتی اور نہ ہی دور ایمان وقت کے اختتام سے قبل واپس آ سکتا ہے (وقت ان معنوں میں جو ہم اس سے سمجھتے ہیں) لہٰذا یہ سوال خاصا معقول معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت حال میں اس کار عبث کا فائدہ؟ سیلاب سے مقاومت کیوں کی جائے؟ پچھلے زمانوں کے عظیم لوگ اور اہل دانش ایک غافل دنیا یا واصل بہ جہنم معاشرے سے فوراً کنارہ کش ہو جاتے تھے۔ اس سے منہ موڑ کر وہ ان چند نفوس کے لیے مثال

قائم کردیتے تھے جوان کے اتباع کے لیے تیار ہوں۔ یہ گمان انھوں نے کبھی نہیں کیا کہ لوگوں کی اکثریت کو کسی دوسرے راستے پر گامزن ہونے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ آج بھی اگر ان لوگوں کے لیے کوئی راہ سکون ہوتی جو ان نظریات اور رائے عامہ کے ڈھانچے کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں جس پر موجودہ معاشروں کی بنیاد رکھی ہوئی ہے تو وہ یقیناً اسی کو اختیار کرتے اور نہ ماننے والوں کو راہ سقر میں پاکوبی کرتا چھوڑ کر خود علیحدہ ہو جاتے۔

ہمارے پاس آج اگر اس کے برعکس منہاج اپنانے اور مناظرہ اور مباحثہ کی گرد اڑانے کا کوئی جواز ہے تو وہ ہمارے موجودہ دور کی صورت حال ہے جس کی کوئی اور مثال ملنی ناممکن ہے۔ اس دور کی خاص بات وہ کوششیں ہیں جو لادین معاشروں نے اپنے افراد کو مکمل طور پر، جسم جاں سمیت، اپنے عمل میں جذب کرنے کے لیے شروع کر رکھی ہیں۔ پرانے لوگوں کے برعکس ہمارے پاس ان معاشروں کو ترک کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں۔ ہمیں جوابی جنگ پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ ہم میں سے جو اس زمانے کے مفروضوں، اس کی ترجیحات، مقدم چیزوں اور اس کے اخلاقی لوازم تسلیم کرنے پر تیار نہیں ان کو واقعی یلغار کر کے ایک کونے میں گھسنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ بعض تہذیبیں اور معاشرے دوسرے معاشروں سے بدرجہا افضل و برتر ہیں مگر ہم مجبور ہو چکے ہیں کہ تہذیبوں کے اعتباری یا نسبتی کمال اور موازنہ کو چھوڑ کر یہ دیکھیں کہ انھوں نے اپنے باشندوں کو کس حد تک جکڑ کر محبوس و مغلوب کر رکھا ہے۔

افریقہ اور دوسرے مقامات پر بڑھتی ہوئی آبادی نے جنگلی جانوروں کے مسکنوں اور گزر گاہوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا ہے اور کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب جنگلی جانور (آلڈس ہکسلے Auldous Huxley کی کتاب *Brave New World* کے وحشیوں کی طرح) صرف مخصوص پناہ گاہوں میں پائے جائیں گے۔ اسی طرح وہ لوگ جو موجود زمانے سے علیحدہ سوچ رکھتے ہیں اور صرف اس ''بلبلے کی دنیا'' ہی کو حقیقی اور واحد دنیا نہیں سمجھتے، جلد ہی کسی راہ فرار سے محروم ہو جائیں گے اور اس معاشرے کے چنگل سے بچ نہ سکیں گے جو اپنے باشندوں کے بچپن ہی سے ان کے ذہن پر مختلف ذرائع سے قابو پانا شروع کر دیتا ہے۔ یہ برین واشنگ ایمان والوں کی موجودہ نسل کے ایمان کو اگر کر سکی تو غارت کرے گی ہی مگر ان کی آنے والی نسلیں اس حق و ایمان کا قیاس تک کرنے کے قابل نہ ہوں گی۔ ان کے ذہن میں یہ تصور ہی نہ آسکے گا کہ انسانوں کا سماجی اور اقتصادی طور پر کارآمد بننے کے سوا کوئی اور منصب بھی ہے۔

چند دور دراز اور تنہا مقامات کو چھوڑ کر اب دنیا میں غالباً کہیں خدا مرکز معاشرے نہیں پائے جاتے۔ اس لیے ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ فلاں فلاں سماجی نظام بڑا منظم، مربوط، فائدہ رساں یا کارآمد ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں الوہی عناصر کا دم تو نہیں گھونٹ دیا جاتا اور کیا وہ فکری طور پر اجنبی، مختلف المرکز لوگوں اور ایسی شخصیات کو برداشت کرتا ہے جو اس کے اجتماعی مزاج میں ضم ہو جانے کی مزاحمت کرتے ہوں۔ جدید لادین معاشروں کا واضح رجحان یہ ہے کہ انسان پر راہ خروج بند کر دی جائے اور اس کی ساری رفعتیں ہموار کر کے اسے صرف اس کی ارضی جہت و منہاج تک محدود کر دیا جائے۔ اس انسان کو جو صورت الٰہی پر تخلیق ہوا اور عظمت کے تمام امکانات کا حامل ہے، صرف سماجی حیوان اور اقتصادی فاعل بنا دیا جائے۔ اس رجحان کا مقابلہ اس کی اپنی سطح پر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس سطح پر اس قبیل کے رجحانات میں کچھ ایسی ناگزیر قوت ہوتی ہے جیسی فطرت کی قوتوں سے منسوب کی جاتی ہے۔ صرف مذہبی نقطہ نظر ہی میں اس رجحان کی مزاحمت و مقاومت کی پختہ بنیاد تلاش کی جا سکتی ہے مگر یہ واضح رہے کہ مذہب وہ ہونا چاہیے جس کی جڑیں ماورا میں پیوست ہوں نہ کہ انفعالی مذہبیت اور پیش پا افتادہ فرسودہ اقوال۔ صرف اسی بنیاد پر ان لوگوں کی مدد کرنا ممکن ہے جنھوں نے دباؤ میں آ کر اس دور کی اجتماعی اخلاقیات کے خلاف سپر تو ڈال دی ہے مگر تشکیک اور بے یقینی سے۔ صرف اسی نقطۂ استدلال سے انھیں یہ یقین دلانا ممکن ہے کہ ان کے شکوک ایک صحیح اور صحت مند وجدان سے پھوٹے ہیں اور ان کو انسانی روایت کی پوری تائید حاصل ہے۔

اس سیاق و سباق میں ''الدین'' کا نام لینا کہاں تک بجا ہے جب کہ ہمارے سامنے بہت سے مذاہب ہیں جو کتنے ہی مقامات پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں؟ اس کے جواب میں بات بہت سخن گسترانہ آ پڑتی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اتنا تو سب جانتے ہیں کہ دین کا منبع واحد ہے جو ماورا الطبیعاتی ہے۔ حق ایک ہے مگر یہ لامحدود بھی ہے اس لیے صورت سے ورا بھی (چونکہ ماہیت اشیا یہی ہے کہ ایک صورت دوسری صورت کا استثنا کرتی ہے: ایک ہی چیز بیک وقت گول اور چوکور نہیں ہو سکتی)۔ انسانی سطح پر حق خود کو لازماً انسانی ذہن میں موجود نقشہ کے مطابق ڈھال لیتا ہے وگرنہ انسانی ذہن کے لیے اس کا ادراک محال ہو جاتا ہے۔ اس کی تشکیل اس ماحول سے بھی ہوتی ہے جس میں اس کا ظہور ہوتا ہے اور ان لوگوں کی نوعیت سے بھی جن کے درمیان یہ تصورات، تشبیہات اور اخلاقی قواعد کا لباس اختیار کرتا ہے ایسے ہی جیسے روشنی رنگوں میں اس وقت بٹتی ہے جب اس کا گزر کسی واسطے سے ہوتا ہے۔ ایک اعتبار سے تنوع کا یہ مظاہرہ ہستی کا جواز ہے۔

مذاہب جن کے ذریعے انسانوں نے حقیقت کو سمجھا ہے اگر اس تنوع کے سب سے زیادہ حامل نہ ہوتے تو یہ امر باعث حیرت ہوتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک اور تمثیل دیکھیے۔

اب کی دفعہ ایک ایسے مقام کا تصور کیجیے جو بذات خود تو ہمارے پرانے منظر کی طرح زرخیز ہے مگر اس کو چاروں طرف سے ایک صحرا نے گھیر رکھا ہے جس کی کوئی انتہا نظر نہیں آتی۔ اس جگہ ایک بہت بڑے پہاڑ کے گرد ایک دائرے کی شکل میں بہت سی اقوام اور بہت سے قبائل آباد ہیں۔ یہ پہاڑ اس سارے منظر پر چھایا ہوا ہے۔ اس پہاڑ کا شکوہ اس کے گرد رہنے والے مختلف انداز میں جان سکتے ہیں۔

معدودے چند لوگ وہ ہوں گے جو اس پہاڑ کو بحیثیت کل اور من کل الوجوہ جانتے ہوں گے۔ چاہے انھوں نے اس پر چڑھ کر دیکھ رکھا ہو یا ان کو نگاہ دور بین عطا ہوئی ہو جس سے وہ پہاڑ کے مختلف پہلوؤں کو ایک کل میں ضم دیکھتے ہوں گے۔ کچھ دوسرے لوگ ایسے ہوں گے جو اس کو صرف ایک خاص اور لہٰذا محدود نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوں گے۔ انھیں اس کے بعض حصے تو صاف نظر آ رہے ہوں گے اور وہ جہاں تک ان کا تناظر اجازت دیتا ہے، صحیح دیکھ رہے ہوں گے۔ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کی نگاہ میں خرابی ہے یا جو زیادہ فاصلے پر ہیں۔ ان کے مشاہدے کی راہ میں دھند حائل ہوگئی ہے اور ان میں پہاڑ کے بارے میں باہمی اختلاف اور عدم یقین پایا جاتا ہے۔ آخری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کے آلات حس تو شاید درست ہیں مگر وہ پہاڑ کی طرف پشت کیے کھڑے ہیں اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے بھورے رنگ کے یکساں اور بیزار کن میدان کی حالت بیان کر رہے ہیں اور ٹھیک ٹھیک بیان کر رہے ہیں۔ تاہم ان کا دیکھنا بے نتیجہ ہے اور جب تک وہ اس رخ پر کھڑے رہیں گے پہاڑ اور اس کے کسی پہلو کے بارے میں کوئی مفید رائے ظاہر نہیں کر سکیں گے۔ یہ لوگ اس بحث وتمحیص اور اختلاف سے بارہ پتھر باہر سمجھے جائیں گے جو صحیح سمت میں دیکھنے والوں کے درمیان برپا ہے۔ ہاں خواہ بزعم خود وہ سمجھے بیٹھے ہوں کہ اور کسی فرد کو بھی اس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا جو وہ صحرا کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ ان کے لیے کچھ نہیں۔ نہ کوئی قوت، نہ جلال، کچھ بھی نہیں!

پہاڑ حق کی علامت ہے ــــ صداقت کا نشان ہے ــــ یہ الوجود کی علامت ہے ــــ پہاڑ ''الحقیقہ'' (Reality) ہے جس کے علاوہ کوئی چیز مکمل طور پر حقیقی نہیں۔ پہاڑ دائرے کے مرکز پر واقع ہے اور تمام راستے جو اس کی طرف نہیں جاتے صحرا میں لے جاتے ہیں جہاں انسان سراب کا شکار ہو کر پیاس سے مر جاتے ہیں۔

وہ لوگ جنھوں نے اسے بحیثیت کل دیکھا ہے اور من کل الوجوہ، جانا ہے یا کم از کم وہ اس کی کلیت کا تصور کر سکتے ہیں ان کے مابین اختلاف کی کوئی وجہ نہیں۔ ہاں علامات کا اختلاف ممکن ہے۔ دوسرے تمام لوگوں میں تناظر کے اختلاف کی وجہ سے اختلاف ہونا ناگزیر ہے۔ صرف اور صرف اسی سیاق وسباق میں دونوں متحارب گروہ درست ہو سکتے ہیں (اور ٹھیک دعویٰ کر رہے ہیں کہ خدا ہمارے ساتھ ہے) کیونکہ دونوں کے پاس حقیقت ہے۔ ہاں جزوی حقیقت ہے اور یہ فطرتِ اشیا میں شامل ہے کہ ٹوٹی پھوٹی یا ادھوری حقیقت باعث نزاع ہوتی ہے۔ حقیقت کی ان کرچیوں میں بھی اتنی قوت اور تنویر ہے کہ جب یہ متحارب لوگوں کے قلب و ذہن میں رچ بس جاتی ہیں تو زندگی کی اہمیت کچھ نہیں رہتی اور موت تو کھیل معلوم ہوتی ہے۔

جنھیں گہری نظر اور واضح فہم عطا ہوا ہے ان کا بیان ہے کہ ''حق'' خیرہ کن حد تک سادہ ہے البتہ اس کے ادراک، فہم اور اظہار کے طریقے اتنے ہی متنوع ہیں اور اس سے دل تھوڑا کرنے کی کسی طرح بھی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ ان انسانی اذہان کے تنوع اور ترکیب کے مطابق ہے جن کے لیے حق مطلوب ہے۔ مگر ان لوگوں کی اس سے برأت نہیں ہو سکتی جو سیدھے سادے غیر مسئول ایمان کو اپنے ذوق کے لیے بچگانہ اور احمقانہ کہہ کر رد کرتے ہوئے سوالات تو کر دیتے ہیں مگر جواب کا انتظار نہیں کرتے۔ اس قبیل کے لوگوں میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو عمر بھی کسی وقتی دلچسپی کے ادنیٰ سے موضوع پر کاوش و مطالعہ کرتے رہتے ہیں مگر اس علم اعظم کے حصول کے لیے جو کبھی زر و جواہر دنیا میں سے عظیم ترین خزانہ سمجھا جاتا تھا، ذرا مشقت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اسے شایان حصول نہیں سمجھتے جب تک وہ بآسانی قابل حصول نہ ہو۔ اس طرح وہ اپنے انسانی ورثہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اپنی استعداد کا زیاں کرتے رہتے ہیں۔

یہ زمانہ جس میں ہم زندہ ہیں ازلی انسانی معیار یا نمونے کے حوالے سے ملزم قرار پاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انسانوں کی ہمت افزائی کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی خواب غفلت میں گزار دیں۔ اپنے ورثہ سے غفلت میں اور ان چند چیزوں سے غفلت میں جنھیں جاننا فی الحقیقت ضروری ہے۔ یہی اس کے مرض کی جڑ ہے۔ اسی ورثہ میں وہ حبل متین ہے، وہ چٹان ہے جسے ہر اس شخص کو مضبوطی سے تھامنا ہوگا جو زمانے کی رو میں بہ جانے کے لیے تیار نہ ہو۔

باب دوم

جعلی بستیاں

ہمیں بنانے میں بڑی حد تک ہمارے فیصلوں اور ہمارے چناؤ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ ہمارے ہر چناؤ کے ساتھ اس تصویر میں کچھ نقوش کا مزید اضافہ ہو جاتا ہے جو مکمل ہونے پر یہ دکھائے گی کہ یکتا اور نا قابلِ تکرار طور پر ہم کیا ہیں۔ اس چناؤ کے نتائج اس طرح پھیلیں گے جیسے تالاب کے کھڑے پانی میں پھینکے ہوئے کنکر سے دائرہ در دائرہ لہریں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ ہمارے گرد و پیش کے لوگوں میں بھی کچھ تبدیلی واقع ہوگی خواہ تھوڑی سی ہی کیوں نہ ہو، لیکن یہ نتائج اس قرب و جوار کے علاوہ اس سے ورا ایسے ساحلوں تک پہنچتے ہیں جن کا ہمیں گمان بھی نہیں گزرتا۔ جو انتخاب ہم کرتے ہیں وہ ہمارا ہوتا ہے کسی اور کا نہیں اور اس کے بے شمار اثرات و نتائج بھی ہم ہی کو بھگتنا ہوں گے۔ یہاں یا کسی اور جگہ، اب یا تب، جلد یا بدیر، ہم بہر حال ہر اس فیصلے کے لیے جوابدہ اور ذمہ دار ہیں جس پر ہماری مہر ثبت ہے۔

اس بات کو عملاً اور بلاواسطہ طور پر سمجھنے کے لیے لازمی ہے کہ انسان کے پاس نقل و حرکت کی اتنی آزادی اور گنجائش ہو جہاں وہ اپنے امکانات کو بروئے کار لا سکے۔ صرف آزادیٔ انتخاب ہی کافی نہیں! اسے اپنی مرضی کے مطابق نیک یا بد مصرف کے لیے استعمال کرنے کا موقع بھی میسر ہونا چاہیے۔ اس موقع کے بغیر شخصی آزادی کے تصور میں کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔ انسانی انتخاب کی اپنی کچھ لاینفک قیود اور بندشیں ہیں جو مرتبۂ انسانی کی قیود کا عکس ہیں۔ بشرطیکہ مرتبۂ انسانی کو اس سے بالاتر مرتبے کے حوالے سے اور اُس ارادۂ مطلقہ (الٰہیہ) کے اعتبار سے دیکھا جائے جس کی ایک شبیہ ہماری تمام قوتیں ہیں۔ لیکن یہ دوسرا معاملہ ہے۔ فی الحال ہم انسانی تجربے اور انسانی سطح کی بات کر رہے ہیں۔ اس سطح پر اور اس تجربے کے حوالے سے انسانوں کو انتخاب کرنے کے لیے تخلیق کیا گیا ہے اور اس اعتبار سے وہ ایسی ذمہ دار ہستیاں ہیں جو اپنی چھوٹی سی دنیا میں ہونے والے افعال کے لیے جوابدہ ہیں لیکن انسان کی ذمہ داری صرف اس چھوٹی سی دنیا تک محدود نہیں کیونکہ ہم

ازروئے فطرت اپنے اس خول کے مکمل طور پر اسیر نہیں ہیں جسے ایک دن فنا ہو جانا ہے۔ ہم ان سب باتوں سے اچھی طرح آگاہ ہیں اور رہیں گے جب تک ہماری عقلِ سلیم پر دروغ وفریب اور سوفسطائیت کے پردے نہیں پڑ جاتے۔

بچہ جونہی بولنے کے قابل ہوتا ہے کچھ اس قسم کے سوالات پوچھنے لگتا ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کی دنیا کو سمجھنا چاہتا ہے۔ ٹوٹا ہوا برتن، آنکھ پھوٹی گڑیا اور زمین پر پھیلے دودھ کو دیکھ کر وہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ کس نے کیا ہے؟ سادگی کے اس زمانے سے بہت آگے نکل آنے کے بعد بھی ہم یہ باتیں پھر سے پوچھنا چاہتے ہیں گو ہمارا یقین ڈگمگا چکا ہوتا ہے کہ ان سوالات کا جواب دیا بھی جاسکتا ہے یا نہیں؟ افعال وواقعات کو ان کے ذمہ دار افراد کے حوالے سے پہچاننا ایک عالمگیر انسانی ضرورت ہے۔

پچھلی ایک صدی کے دوران انسانی صورت حال میں جتنی بھی تبدیلیاں آئی ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اب افعال وحرکات سے ان کے فاعل اور محرک کا سراغ لگانا دشوار ہوتا جارہا ہے۔ پچھلے زمانوں میں یا سادہ معاشروں میں ہر فعل پر اس کے فاعل کی چھاپ ہوتی تھی۔ آج کے پیچیدہ معاشروں میں اگر کسی خاص فعل کے لیے کسی ایک شخص کو ذمہ دار ٹھہرانے کی کوشش کی جائے تو اس کے لیے ایک فلسفۂ اخلاق کے مفکر اور ایک جاسوس کی مشترکہ خدمات حاصل کرنا ہوں گی۔ آج حکومت، سماج یا ادارہ عمل کرتا ہے۔ فعل ''اُن'' سے سرزد ہوتے ہیں لیکن اس صیغۂ جمع ''ان'' سے نہ تو محبت کی جاسکتی ہے نہ ان پر الزام لگا کر ان پر گرفت کی جاسکتی ہے چنانچہ اپنے جیسے انسانوں سے افعال کو منسوب کرنے کی ضرورت کی تسکین نہیں ہو پاتی۔

آج کے دور میں انسانی فرض مسؤلیت کی تعریف نئے سرے سے متعین کرنی پڑے گی کیونکہ ہمارا موجودہ معاشرہ ملازمت پیشہ اور حکومتی اہلکاروں کا معاشرہ ہے جس میں لوگ اجتماعی نظام کا ایک پرزہ بن چکے ہیں اور اپنے افعال واعمال میں ان کا اسی قدر ہاتھ ہوتا ہے جتنا پرانے وقتوں کے حلقہ بگوش زرخرید غلاموں کا ہوا کرتا تھا۔ یہ نظر ثانی اس لیے بھی ضروری ہے کہ مستقبل کے بارے میں جس حد تک پیش گوئی ممکن ہے اس کے حساب سے نظر یہی آرہا ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک ایسی پیچیدہ تر تنظیم کی طرف بڑھ رہا ہے جس میں کسی بھی ایسے شخص کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی جو بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر حکومتی اہلکار یا ملازمت پیشہ نہیں ہوگا۔ اسے اچھوت نہیں تو خبطی ضرور سمجھا

جائے گا۔ اشتراکی معاشروں میں یہ ایک تسلیم شدہ نصب العین ہے۔ سرمایہ دار ممالک میں بھی یہ ایک ایسی چیز ہے جو قصداً تو نہیں مگر ناگزیر طور پر سامنے آ رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج امریکہ میں جسے ''آزاد تجارت'' کا گھر کہا جاتا ہے، ننانوے فی صد ملازمت کرنے والے کسی نہ کسی ادارے سے وابستہ ہیں جبکہ اس صدی کے آغاز میں وہ اپنا کاروبار کرتے تھے۔

تکنیکی ترقی اور بڑھتی ہوئی آبادی کی جو دنیا ہم نے اپنے لیے تخلیق کی ہے اس کی بقا کے لیے زیادہ سے زیادہ اجتماعیت اور تنظیم کی ضرورت ہے چاہے یہ کسی بھی نظریاتی نعرے کے تحت کام کرے۔ جب تک ممکن ہوا یہ دنیا باقی رہنے کی کوشش کرے گی چاہے اسے اپنی بقا کی قیمت اپنی آزادی کی قربانی اور اقدار کی بربادی کی صورت میں ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔

وہ لوگ جو خلافِ واقع انداز میں یہ سمجھتے ہیں کہ انسان خود کو ماحول کے مطابق ڈھالنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے انھیں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ موجودہ دور جس میں زیادہ تر ذمہ داری فرد کے کندھوں سے اٹھا کر ریاست کی غیر شخصی مشینری کو منتقل کر دی گئی ہے، ایسی شدید تشویش اور احساس عدم تحفظ کا دور کیوں ہے؟ وہ نہیں جانتے کہ بیشتر لوگ اسی صورت میں اعتماد اور توازن سے قدم اٹھا سکتے ہیں جب ان کے کندھوں پر ان کی سکت کے مطابق وزن بھی موجود ہو۔ اس بوجھ کے بغیر ان کے پاؤں دھرتی پر نہیں جمتے۔ بوجھ اتار کر وہ اڑنے کے قابل تو ہو نہیں پاتے، ہاں چلنے کی قوت ضرور کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ ایک اور بنیادی ضرورت ہے، دنیا کو سمجھنے کے لیے ہمیں نہ صرف افعال کے فاعل کا علم ہونا چاہیے بلکہ ہمارے لیے اپنی ذمہ داری کی ماہیت سے آگہی اور اپنے فطری فرائض کا ادراک بھی ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ہم ناآسودہ حالت میں مکمل غیر ذمہ داری (جس میں احساسِ جرم ہمیشہ ستاتا رہتا ہے) اور مبالغہ آمیز تصورِ فرائض و واجبات کے درمیان ڈولتے رہتے ہیں۔ خدائی فوجدار اور آوارہ نکھٹو دونوں ایسی سرزمین کی پیداوار ہیں جس سے سرحدوں کے نشانات غائب ہو چکے ہیں۔

حد بندیاں اور راستے کے نشانات سے اگر ہمارے اندر پابندی یا روک ٹوک کا احساس ابھرتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم انھیں مصنوعی طور پر ٹھونسی ہوئی ایسی چیز سمجھتے ہیں جو ہمارے منظر نامے کا حلیہ بگاڑ دیتی ہیں ــــ مرغزارِ حیات میں پھیلے ہوئے اجلے سفید کھمبے اور باڑیں ــــ جبکہ حقیقتاً موثر جنگلے اور رکاوٹیں یا تو منظر کے اندر خلقی طور پر موجود ہوتی ہیں یا اتنی مانوس اور پرکھوں

پرانی ہوتی ہیں کہ ان پر نگاہ ہی نہیں جاتی۔ انسانوں کو ایک نہ ایک قالبِ عمل درکار ہوتا ہے مگر انھیں یہ پتہ نہیں چلنا چاہیے ــــ یا کم از کم ہر وقت یہ یاد نہیں آنا چاہیے کہ وہ ایک لائحہ عمل کے اسیر ہیں۔ شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو اپنے جسم کی طرف سے عائد کردہ قیود اور مجبوریوں ــــ نیند کی ضرورت، بھوک پیاس کے دائمی تقاضے ــــ سے مضطرب ہوتا ہو لیکن اگر کہیں ہمارے بدن، اپنی ہیئت اور صلاحیتوں کے اعتبار سے ہفتہ وار تبدیل ہوا کرتے تو زندگی ایک بھیانک خواب بن کر رہ جاتی۔

قالبِ عمل پر اس انداز سے گفتگو کرنا اور سوچنا کہ انھیں حسبِ سہولت ایجاد اور تعمیر کیا جا سکتا ہے خود اس بات کی نشانی ہے کہ انسانی زندگی کی صورت حال میں ایک انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ اس انقلاب کی جڑیں اگرچہ ان تبدیلیوں میں تلاش کی جا سکتی ہیں جو کئی سو سال پہلے شروع ہوئی تھیں تاہم اس کے نتائج نے اب جا کر کہیں بنی نوع انسان کی اکثریت کو اپنی گرفت میں لیا ہے بلکہ مغربی دنیا کے مرد و زن کو بھی کہیں گذشتہ صدی میں آ کر اس کے پورے اثرات کا احساس ہوا ہے۔ معاصر ''اساطیر (Myths) ارتقائیت، مادیت پرستی، مساوات پرستی ــــ نے جدید ٹکنالوجی کی بھرپور امداد سے فرد کو دھرتی، ہنر و حرفت اور خاندان جیسی کائناتی اور سماجی اشیاءِ مسلسل و پیہم سے توڑ کر انسانی زندگی کو اس کے نارمل سانچے سے محروم کر دیا ہے۔

انسانی قالبِ عمل (Framework) میں ایسی اساسی اور دوررس تبدیلی اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ قبل ازیں زندگی کے احوال و ظروف میں آنے والی تبدیلیاں ہمیشہ ایک ایسے نقشے سانچے کے مطابق ہوا کرتی تھیں جو اپنی حدود کے اندر کم از کم انسانوں کو مستقل معلوم ہوتا تھا خواہ مؤرخ کی طائرانہ نگاہوں میں اس کی حیثیت کچھ بھی رہی ہو۔ حالیہ صدی کے آغاز سے لے کر اب تک جو کچھ وقوع پذیر ہوا ہے اسے جذب کرنے اور جانچنے پرکھنے کے لیے درجن بھر نسلوں کی مدت بھی شاید ہی کافی ہو سکے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اپنی بقا کی جدوجہد میں پھنسی ہوئی ہر مخلوق کی طرح ہم بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں اور ہمارے اردگرد جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بیشتر حصہ ہماری گرفتِ توجہ سے پھسل جاتا ہے۔

رفتارِ سفر اگر ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو ہر شے دھندلا جاتی ہے۔ دور کی چیزوں کے خدوخال گو پھر بھی قدرے واضح نظر آتے ہیں تاہم پیش منظر کی دھندلاہٹ ان پر دھیان دینا ناممکن بنا دیتی ہے اور منظر بے اصل پا کر ایکسپریس ٹرین کے مسافر اپنی اپنی کتابوں یا خیالات کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔

ہمارے عہد کی موضوعیت (Subjectivism) میں بڑا حصہ اس ایک طرح سے کسی سریع الرفتار سواری میں قید ہو جانے کے احساس کا ہے اور یہ امر کہ یہ سواری ہم نے خود بنائی ہے (جیسے بچے اَن تھک محنت سے کاٹھ یا تار کا کھلونا بناتے ہیں) ہمیں اس احساس سے نجات نہیں دلا رہا کہ ہم ایسے پھندے میں پھنس گئے ہیں جس سے فرار کی کوئی امید نہیں۔

اس قسم کی جتاتی رفتار کا ایک اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حسّیات جن کے ذریعہ ہم ماحول سے رابطہ قائم کرتے ہیں سُن ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جب ان حسّیات کا عمل ہی معطل ہو جائے تو یہ ہونا بالکل طبعی چیز ہے۔ اگر واقعات کو جذب کرنے کی گنجائش ہی میسر نہ ہو تو ہماری قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں اور ایک طرح کی بے حسی اور سکتہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر کسی بھی چیز کا نہ تو بھرپور ذائقہ نصیب ہوتا ہے نہ صحیح ادراک ــــ حتیٰ کہ خوف بھی جو خطرے کی گھنٹی ہوتا ہے، معطل ہو جاتا ہے۔ تبدیلی کی موجودہ رفتار از خود بھی مذکورہ نتائج پیدا کرنے کے لیے کافی تھی چہ جائیکہ ماحول بھی ان اثرات میں شدت پیدا کرنے کا موجب بن گیا ہے۔ وہ ماحول جس میں انسانوں کی اکثریت آج زندگی بسر کر رہی ہے، وہ ماحول جو فوری اور قلیل المیعاد ضرورتوں کو پورا کرنے والی 'خادمہ' ٹکنالوجی نے پیدا کر رکھا ہے۔ سوائے فنی تخلیقات کے جو ہماری جسمانی ضروریات سے ورا ہیں، ہمیں اپنی تیار کردہ ہر شے سے بیزاری ہوتی ہے۔ وہ لوگ خاصے حق بجانب ہیں جو ایک چیز تعمیر کرتے ہیں، چند آسودہ لمحات میں اسے سراہتے ہیں اور پھر اسے ڈھا کر کوئی اور نئی چیز بنانے کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔ ایک مکمل طور پر انسان ساختہ ماحول میں، اپنی ہی مصنوعات کے شور شرابے میں گھر کر زندگی گزارنے سے ہم ایک تنگ دنیا میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ اس تنگنائے میں ان چیزوں تک پہنچنے کی ہر استعداد گھٹ کر رہ جاتی ہے جو عالمِ بشری سے ورا واقع ہیں۔

اپنی بدنمائی اور عالمِ فطرت سے بُعد کے اعتبار سے یہ ماحول منکرین کے نفس کا خارجی پرتو ہے۔ ساتھ ہی یہ ان کے فلسفے کا عکس بھی ہے۔ یہ ماحول کوئی روحانی غذا فراہم کرنے کی سعی نہیں کرتا۔ کرے بھی کیوں! جبکہ اس کا کل مقصد تو چند عملی تقاضوں کی تسکین ہے۔ حسّیات میں یہ ماحول ہیجان تو برپا کرتا ہے مگر انھیں کوئی سکون نہیں دے پاتا۔ اس کی پیش کش صرف ایک ایسا سیاق و سباق ہے جس میں لگاتار اور اکثر بے مقصد سرگرمی جاری رہ سکے۔

ایک بنجر ماحول کے کارن حسّیات پر جو سکتہ طاری ہوتا ہے اس میں اور ''خوابیدگیِ حسّیات'' میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ یہ ''خوابیدگی حسّیات'' یا حسّیات کا سکونی ٹھہراؤ اس احساس جمال سے پیدا ہوتا

ہے جس میں دو دنیاؤں کے درمیان کی رکاوٹیں تحلیل ہو جاتی ہیں یا پھر فوری محسوسات سے ورا کی چیزوں پر ایسے ارتکازِ توجہ سے عمل میں آتا ہے جس سے حقیقت مدرکہ دھندلی نہیں بلکہ شفاف ہو جاتی ہے۔ نفوذِ جمال اور استحکامِ ارتکاز کے لیے وقت اور ٹھہراؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جدید سیاق و سباق میں واقعات جس رفتار سے پے در پے جنم لیتے ہیں اور ان واقعات کے قالب جس سرعت سے شکل بدلتے رہتے ہیں ان کی بدولت مہلت اور ٹھہراؤ دونوں ہی ہماری اقلیم حیات سے ملک بدر ہو چکے ہیں ـــ دھندلائے ہوئے اس منظر، اس تیرہ تار مکان میں واضح اور کڑے متبادلات کا چناؤ اور اس چناؤ کی ذمہ داری قبول کرنا دوگنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کے لیے وقت اور ٹھہراؤ درکار ہے۔

ہر دم بدلنے والا ماحول صرف ایسے انسانوں کو جنم دے سکتا ہے جن کی چناؤ کی استعداد شکستہ و متزلزل ہو چکی ہو ـــ سمندر کی موجوں میں کیونکر انتخاب کیا جا سکتا ہے؟ پھر انسان بھی وہ جو خود روحانی غذا اور مکانی استقرار سے محروم ہو کر اس بدلتے ہوئے منظر نامے میں کسی مستقل نکتے پر نہیں رہ گیا۔ اس کا متغیر ماحول اسے ہر آتی جاتی رو اور ہر رخ بدلتی ہوا کے مطابق ڈھلنے پر مجبور کرتے کرتے اس کے اندر ایسا عدم استحکام پیدا کر دیتا ہے جو اس کی قوتِ فیصلہ کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس کے ہم جنسوں نے جو دنیا اپنے گرد تعمیر کر رکھی ہے اس کا معیارِ حرکت اگر برقرار رہنا ہے تو انسان کو اس کے مطابق ڈھلنا، اس سے قدم ملا کر چلنا ہوگا ورنہ وہ عدمِ حقیقت کی ارضِ لاوارث پر جا نکلے گا۔ حقیقی دنیا یہ ہے۔ اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ باقی سب کچھ بے اصل ہے۔ اسی میں جو ہو سکے کرو جو فائدہ اٹھا سکو اٹھاؤ ـــ یہی آج آدمی کے ذہن میں ٹھونسا جا رہا ہے۔

اس کو، عام آدمی کو، انبوہِ انسانی کے فرد کو، مضبوط اور محسوس اشیا کے اس ماحول میں سے اکھاڑ لیا گیا ہے جو انسانی نسلوں کے حوالے سے مستقل رہا ہے اور اکھاڑ کر ایک قابلِ تبادلہ آلۂ کار بنا دیا گیا ہے۔

وہ کاشت کار جو دھرتی کی دیکھ بھال نہیں کرتا یا اپنی فصلوں کی سینچائی سے غفلت کرتا ہے بہت جلد اپنی غلطیوں کا خمیازہ بھگت لیتا ہے اور چونکہ ایک قسم کی حقیقت اس پر ایسا سخت دباؤ ڈال چکی ہوتی ہے کہ وہ اسے جھٹلانے یا نظر انداز کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا لہٰذا دوسرے میدانوں میں بھی وہ حقیقی اور خیالی اور لازمی اور غیر ضروری کے درمیان امتیاز کرنے کا قرینہ سیکھ جاتا ہے۔ جبکہ ملازمت پیشہ یا سرکاری اہل کار بیکار نظریات اور فاش اغلاط کے جلو میں طویل عرصہ تک گزر بسر کرتے رہتے ہیں تاوقتیکہ ان پر کسی حقیقت کا در وا نہ ہو جائے۔ تھیوں خود بھی کسان

گھرانے سے ہے، اس نے لکھا ہے کہ:

کاشت کاروں میں خواہ خرابیاں دوسرے لوگوں جتنی ہوں مگر کجروی اور انحراف کمتر ہوتا ہے۔ ان کی نیکی سے زیادہ میں ان کی صحت مندی سے متاثر ہوں۔

کجروی سے اس کی مراد وہ قطعاً نہیں ہے جو اخلاق پرستوں کے ہاں پائی جاتی ہے بلکہ کجروی حقیقت سے کسی بھی سطح پر منہ موڑنے کا نام ہے۔ چاہے پیروں تلے زمین سے ہو یا سر پر پھیلے ہوئے آسمان سے۔ روشنی سے منہ موڑ کر اپنے اپنے اندھیروں میں سمٹ جانے کا نام۔

دہقان، جس پر مہذب افراد ناک بھوں چڑھاتے ہیں، ایک ایسی کھری زندگی کا نمائندہ ہے جس کے مقابلے پر جدید زندگی کا بوداپن اور کھوکھلی بنیادیں مزید نمایاں ہو جاتی ہیں۔ انسانوں کو اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنا کر استحصال کرنے کا فن کمیونسٹوں سے زیادہ کون جانتا ہے مگر وہ بھی دہقانوں کو ترنوالہ نہیں بنا سکے۔

چھوٹا تاجر اور بیوپاری جس طرح مستقل اپنے افعال کے نتائج کا سامنا کرتا رہتا ہے وہ ایک بڑے ادارے کے ارکان کو نہیں کرنا پڑتا۔ مؤخرالذکر کو اپنی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی غیر یقینی اور زیادہ تر غیر حقیقی آرا سے لگانا پڑتا ہے۔ نجی اور معاشرتی زندگی میں پہلے ہی سے وہ ان آرا کا محتاج ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس وہ فطری قوتیں ہیں جو اس کے افعال کا نتیجہ ایسی ناقابلِ خطا باضابطگی سے اس کی طرف لوٹاتی ہیں جو انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ ملازمت پیشہ کی طرف اس کے افعال کا نتیجہ انسانی واسطوں کی چھلنی سے گزر کر لوٹتا ہے چنانچہ وہ ان کو آسانی سے اپنے اعمال کا انجام سمجھنے کے بجائے اپنے افسرانِ بالا کی خیر خواہی یا بدنیتی سے تعبیر کر سکتا ہے۔ پہلے جو فعل اور اس کے نتیجے کے درمیان ایک کھرا صاف رشتہ تھا وہ اب طرح طرح کی پیچیدگیوں کا شکار ہو گیا ہے اور اس کی مختلف تشریحات کی جا سکتی ہیں۔ موضوعیت ہر سطح پر در آئی ہے اور فرد کے لیے یہ جاننا مشکل ہو گیا ہے کہ صداقت کا کیا مطلب ہے اور صداقت یا جھوٹ اور بناوٹ میں کیا فرق ہے۔

غیر مستحکم اور مصنوعی ماحول نیز ایسے پیشوں کے اثرات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں جن میں سبب اور اس کے نتائج کا آپس میں کوئی براہِ راست تعلق نہ ہو لیکن اس کے علاوہ جدید معاشروں میں ایک چیز اور بھی ہے جو آزاد چناؤ اور اس کی ذمہ داری اٹھانے کی صلاحیت تباہ کر دیتی ہے۔ وہ

ہے فرد کی حفاظت جو آجکل معاشرے کی ذمہ داری سمجھی جانے لگی ہے۔ یہ حفاظت صرف حادثات یا ناگہانی آفتوں سے نہیں ہے بلکہ ہر اس مشکل سے بھی جو فرد اپنے لیے پیدا کر سکتا ہے۔ یہاں آ کر ہم ایک اخلاقی ابہام کا شکار ہو جاتے ہیں۔ طوفان سے بچ کر کہیں پناہ لینا اور اس پناہ گاہ میں اپنے ہمسائے کو جگہ دینا فطری سی بات ہے۔ جانتے بوجھتے چوٹ یا نقصان اٹھانا حماقت ہے اور اپنے جیسے دوسرے شخص کی افتاد کو نظر انداز کرنا خباثت۔ مگر دوسرے لوگوں کو ان کی اپنی حماقتوں یا خباثتوں کے نتائج سے بچانا صرف ایک خاص حد تک ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس سے آگے نہ ہماری ذمہ داری ہے نہ ہمیں اس کا حق پہنچتا ہے۔ جس طرح درد کا احساس ہمارے جسم میں ہونے والی گڑبڑ سے ہمیں خبردار کرتا ہے اسی طرح کچھ نہ کچھ مصیبت یا مشکل بھی انسانی زندگی میں خاص کردار ادا کرتی ہیں۔ ان کے بغیر انسان کبھی پختگی حاصل نہیں کر سکتا نہ اپنی دنیا کی ماہیت جان سکتا ہے۔

جب یہ فرض کر لیا جائے کہ موقع ملتے ہی بالغ افراد غیر ذمہ دار بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگیں گے اس لیے بہتر ہے کہ انھیں موقع ہی نہ دیا جائے، تو ایک تنگ نظر، دم گھونٹنے والی سرپرستی جنم لیتی ہے۔ یہ زبردستی کی سرپرستی انھیں بچانے کی کوشش میں اپنے مقصد کا خود ہی گلا گھونٹ دیتی ہے، ہمیں دوسرے انسانوں سے پہنچنے والے ہر ممکنہ ضرر سے بچانے کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کو مضبوطی سے باندھ کر رکھا جائے اور ہمیں بھی پابہ زنجیر کر دیا جائے کہ ہم دوسرے لوگوں کے اعتبار سے اور ان کے لیے ''دوسرے'' ہیں۔ یہ وہ اخلاقیات ہے جو بضد ہے کہ انسانوں کی کلائیاں باندھ دی جائیں، مبادا وہ اپنے گھونسے استعمال نہ کرنے لگیں اور ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں کیونکہ ممکن ہے کہ وہ غلط راستوں پر چل نکلیں۔ ہماری بہبود کے لیے اس بے پناہ فکرمندی کا ایک ہی منطقی نتیجہ نظر آتا ہے کہ ہم سب کو پابند سلاسل کر دیا جائے اس طرح کہ ہم خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں نہ دوسروں کو۔

آگے چل کر ہم اس ضمن میں مزید گفتگو کریں گے کہ کس طرح ایک نام نہاد مفاد عامہ کی خاطر شخصی آزادی کم سے کمتر کی جا رہی ہے۔ اس وقت ہم اس فقرے کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں جو اخبارات، رسائل، ٹیلیوژن اور عام گفتگو میں بار بار سننے میں آتا ہے۔ اس فقرے کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ اگر شخصی آزادی کی تھوڑی سی قربانی سے انسانی جانوں کا بھلا ہوتا ہو تو ہمیں یہ قربانی دے دینی چاہیے۔ کچھ عرصہ بعد یہی فقرہ ہماری آزادی کی قبر پر لوحِ مزار کے طور پر درج ہوگا کیونکہ اس

کے استعمال کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ تھوڑا تھوڑا خسارہ بھی بڑا نقصان بن جاتا ہے۔ حالیہ برسوں میں ایسے لاکھوں نہیں تو ہزاروں خسارے دیکھنے میں آئے ہیں۔ ان کو اس لیے برداشت کیا جاتا رہا ہے کہ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں اس حد کا علم ہے جہاں تک وہ اپنی آزادی کا استحصال برداشت کر سکتے ہیں۔

عام مفروضہ ہے کہ ایک ایسا فطری، انضباطی نظام موجود ہے جو غلامی اور پابندی کو ناقابلِ برداشت اور مہمل مقدار تک پہنچنے سے قبل روک دینے کی ضمانت دے سکتا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ جو حالات ایک نسل کو ناقابلِ برداشت اور مہمل لگتے ہیں اگلی نسل ان کو بے چوں وچرا تسلیم کر لیتی ہے کیونکہ اس نے پچھلی نسل سے ایک سطح نیچے سے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے خسارے اکٹھے ہوتے جانے کی کوئی طے شدہ حد نہیں ہے۔ یاد رکھنے کی بات یہ نہیں ہے کہ کسی نئے قانون یا ضابطے کی کیا اہمیت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ضابطہ بذاتِ خود خفیف اور معمولی ہو۔ یاد یہ رکھنا ہے کہ یہ قانون کس سمت میں اشارہ کرتا ہے، کس رجحان کی غمازی کرتا ہے اور سابقہ اور آنے والے قوانین و ضوابط کے سیاق وسباق میں اس کا کیا مقام ہے؟ یہ بات ذہن میں رکھ کر اگر دیکھا جائے تو ہمارے تحفظ کے نام پر کیے جانے والے بہت سے اقدامات ایک ایسے گراف کو تشکیل دینے والے نقطے نظر آنے لگتے ہیں جو نافرجام بھی ہے اور اپنے مضمرات کے اعتبار سے خطرناک بھی۔

دریں اثنا ہم اپنے آرام دہ محبس میں احساسِ فضیلت سے سرشار (آخر ہم ہی تو ہیں جنھوں نے پہلی مرتبہ صحیح معنوں میں اپنے ساتھیوں کی خبر گیری کی ہے!) دن بدن پدری معاشرے (بلکہ مادری معاشرے) کے دست نگر بنتے جا رہے ہیں اور اس معاشرے کی فراہم کردہ آسائشوں اور فائدوں کو بغیر یہ سوچے سمجھے قبول کرتے رہتے ہیں کہ اس کی ہمیں کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟ اس قسم کے محافظانہ ماحول کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کی طبعی آگہی ختم ہو جاتی ہے کہ دنیا کی ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ شخصی ذمہ داری کا احساس جسم کے اس پٹھے کی طرح مرجھا کر رہ جاتا ہے جو استعمال میں نہ رہا ہو۔ ہمیں کسی ضعیف شخص یا کسی بے سہارا بچے کی مدد کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کیا ضرورت ہے جب یہ فریضہ دوسروں کے حوالے کیا جا سکتا ہے! جب ہمیں ناانصافی یا کسی کی تکلیف نظر آتی ہے تو ہم ''ان'' سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اس کا مداوا کریں اور اگر خود کوئی عملی قدم اٹھائیں بھی تو وہ، زیادہ سے زیادہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے نئے قوانین اور

ضابطوں کے مطالبے تک محدود ہوتا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ اس قسم کی قوانین سازی عمومی تابکاری معالجات کی طرح ہے جو سرطانی خلیوں کے ساتھ ساتھ صحت مند خلیوں کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔

جن افراد کو اپنے افعال کا نتیجہ دن رات بھگتنا پڑتا ہو انھیں ذمہ داری کا مفہوم سمجھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ مفہوم کہ ہر عمل کا ایک صاحبِ عمل ہوتا ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ ان کے وجود پر نقش ہوتا ہے۔ پدرانہ معاشرے کی پیداوار افراد ــــ سرکاری اہل کار، ملازمت پیشہ لوگ ــــ کو ایسا کوئی سبق میسر نہیں ہوتا اور نتیجتاً وہ حقیقت کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں ــــ کھری اور حقیقی دنیا میں رہنے کا احساس جب جاتا رہے تو انسان کا وہ تصورِ ذات بھی کمزور پڑ جاتا ہے جس کے تحت وہ خود کو ایک ایسے ماحول پر کارفرما ہونے کے قابل سمجھتا ہے جو اس کی روزمرہ کی درمیانی دنیا کے علاوہ جنت اور جہنم کی جہات پر بھی مشتمل ہے۔ دورِ حاضر میں انسان کا جو تصور پیش کیا جاتا ہے اس کے حوالے سے تو ذمہ داری کا نظریہ ہی مضحکہ خیز لگنے لگتا ہے۔ یہ حقیر اور لاچار بالشتیہ ایسے افعال کا مالک اور خالق کیسے ہو سکتا ہے جن کی بازگشت تمام عوالم میں سنائی دیتی ہے۔

انسان بحیثیت ایک مجرّد تصور کے ہمیں خواہ کتنا ہی بااختیار معلوم ہوتا ہو، وہ انسان جس نے مبینہ طور پر عالم طبعی کو مسخر کیا (اور پہلی بار اسی دھرتی کے سینے پر دائمی ناسور پیدا کیے جو اسے اُٹھائے ہوئے ہے)۔ ہمارے دور کے عام آدمی کو قوت کا کوئی خاص احساس نہیں ہوتا۔ وہ تسخیر کے عمل پر کوئی اختیار نہیں رکھتا بلکہ خود اس کا اسیر ہے اور کبھی کبھی تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی بے ڈھنگے حادثے کے نتیجہ میں اس عمل میں ملوث ہو گیا ہو۔ شاید ہی کچھ لوگ ایسے ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ ان کے کسی فعل یا خواہش سے تکنیکی اور سائنسی ترقی کو روکا جا سکتا ہے۔ یہ بات البتہ اکثر لوگ جانتے ہیں کہ خود اس ترقی میں اس کی تلپٹ ہونے اور تباہی کے امکانات مضمر ہیں ــــ اگر ہم ایک ایسے عمل کے خاموش تماشائی ہیں جو ہماری ذہنی، قلبی اور جسمانی قوتوں کا خراج لے کر بھی ہمارے ارادوں اور خواہشات سے بے نیاز اپنے انجام ــــ سربلندی یا تباہی ــــ کی طرف بڑھتا رہے گا تو اس میں قابلِ فخر بات کونسی ہے؟

پچھلے وقتوں کے لوگوں کو اس بنیاد پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے بلکہ حقارت سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ حالات کو اٹل اور تقدیر کا لکھا سمجھ کر مصائب اور نقصانات کو خاموشی سے قبول کر لیتے تھے۔ غور کیا جائے تو ہمارے دور کے بیشتر لوگ بھی اسی ''جبریت'' کے انداز میں اس عمل کو قبول کیے ہوئے

ہیں جس میں وہ بلا ارادہ الجھ گئے ہیں۔ ترقی اور تقدم اپنے تکلیف دہ ضمنی اثرات سمیت ناگزیر ہیں۔ اگر عہدِ حاضر کے سارے ایٹمی اور حیاتیاتی وسائل استعمال کرنے کی ضرورت آن پڑی تو ہمارا دور اِن حربوں کو برتنے سے باز نہیں رہے گا اور جس انفعالی جبریت سے آج کا انسان ان 'ناگزیر' واقعات کو قبول کر رہا ہے اس سے ان جانوروں کا خیال آتا ہے جنھیں مذبح کی طرف لے جایا جا رہا ہو بلکہ شاید وہ وقت یاد آتا ہے جب نازی کیمپوں میں انسانوں کے انبوہ گھسٹتے قدموں سے چل کر خاموشی سے گیس چیمبروں میں موت کے گھاٹ اتر جاتے تھے۔

جب حالات بگڑ جائیں یا یوں کہیے کہ بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہو جائیں تو فوراً یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ یہ ایک عارضی انحراف ہے جسے جلد ہی ٹھیک کر لیا جائے گا کیونکہ فطرت کا قانون ہی یہ ہے کہ ارتقا بہتر کی طرف ہوا کرے۔ اب قوانین فطرت کے ساتھ ایک حتمیت اور اٹل ہونے کا احساس چمٹا ہوا ہے۔ سورج ایک بہت طویل مدت سے ایک مقررہ وقت پر باقاعدگی سے طلوع و غروب ہوتا چلا آ رہا ہے اور اس کے بارے میں آپ صحیح تخمینہ لگا سکتے ہیں۔ ہماری موجودہ صورت حال کے بعض مخصوص پہلوؤں پر سخت تنقید بھی ہوتی رہی ہے اور اکثر کہا گیا ہے کہ انسان نے طبعی کائنات پر جتنی ''ملکیت'' اور دسترس بہم پہنچائی ہے اس کے مقابلے میں اس کی ''اخلاقی ترقی'' کہیں پیچھے رہ گئی ہے تاہم لوگوں کی اکثریت نے یہ بات بلا سوچے اور پرکھنے کی زحمت کیے بغیر تسلیم کر لی ہے کہ ہم جس سمت میں سفر کر رہے ہیں اس سمت کا تعین کچھ ایسے قوانین سے ہو رہا ہے جو اتنے ہی اٹل ہیں جتنے گرتے ہوئے اجسام پر لاگو ہونے والے کششِ ثقل کے قوانین (البتہ اس معاملے میں وہ جسدِ انسانیت کو گرتا ہوا نہیں بلکہ اوپر اٹھتا ہوا جسم تصور کیے ہوئے ہیں)۔ وہ لوگ جو عام طور پر فطری قوانین کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور سمجھتے ہیں کہ ان کو اپنی مرضی سے ڈھالا جا سکتا ہے وہ اس قانون کو اتنی سعادت مندی سے قبول کر لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ قانون فطرت کا نہیں بلکہ ان کا اپنا اختراع کردہ ہے۔ وہ لوگ جو مشیتِ ایزدی اور اس کے سامنے جھکنے کے تصور کو بہ نظرِ حقارت دیکھتے ہیں اور ایسے خدا کے تصور ہی سے چراغ پا ہو جاتے ہیں جو تسلیم و تفویض کا تقاضا کرے وہی لوگ اس عمل کو بلا چوں و چرا تسلیم کر لینے میں پیش پیش ہوتے ہیں جس میں ہم آج گرفتار ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ لوگ اس میں رضامندی سے شریک ہونے کو اخلاقی فریضہ گردانتے ہیں۔ ہر دوسرا رویہ ان کے خیال میں فراری، رجعت پرست اور سماج دشمن

مزاجی رویہ ہے۔ شاید انھیں پرستش کے لیے آخر کار ایک معبود فراہم ہو گیا ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ 'اللہ ان پر رحم کرے'۔

مذہبی عقائد سے اخذ کردہ مطلق اصولوں کے 'نام نہاد' استبداد سے فرار ہو کر ہم صحیح اور غلط اور اوامر و نواہی کے معاملے میں اکثریت کی رائے یا رائے عامہ کی حقیقی اور واقعی آمریت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ مطلق مذہبی اصول چونکہ صرف اسی دنیا سے متعلق نہیں تھے لہٰذا عملاً اطلاق کے لیے ان میں ایک مخصوص لچک پائی جاتی تھی اور عملی زندگی میں ان کی مختلف تعبیرات و تفسیرات کی گنجائش تھی جبکہ آج کی رائے عامہ کی آمریت واقعی آمریت ہے جو کوئی لچک اور گنجائش فراہم کرنے کی روادار نہیں۔

پرانی اخلاقیات دیرپا اور مستحکم تھی پھر بھی اس میں حرکت کی گنجائش تھی۔ جدید اخلاقیات بے لوچ اور بے خرد ہے اور اس خشونت اور صلابت کی تلافی کے طور پر مقبولِ عام آرا کے فیشنوں کی صورت میں اور پروپیگنڈے کے زیرِ اثر سال بہ سال بدلتی رہتی ہے۔ صحیح اور غلط کا ہر نیا نظریہ سابقہ نظریے کو دھکیل کر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ کچھ عرصہ لوگوں کے ذہن پر مسلط رہتا ہے پھر اس کی جگہ کوئی دوسرا نظریہ لے لیتا ہے۔ آج جو شخص رائے عامہ کے اعتبار سے راست باز ہے کہ وہ آج اور اب ہجوم کی رائے کے مطابق عمل کر رہا ہے، گزرے ہوئے کل میں گناہگار سمجھا جاتا تھا اور آنے والے کل میں بدمعاش کہلائے گا۔ اس اخلاقی بلیک میلنگ کو سمجھنے کے لیے مغربی ممالک اور اشتراکی بلاک کے لیڈروں کی تقاریر سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ ان کی اپیل ہمیشہ ان راست فکر، مہذب افراد سے ہوتی ہے جو سب کی بہتری چاہتے ہوں۔ یہی وہ تکنیک ہے جس سے لوگوں کو اس طرح بے وقوف بنا لیا جاتا ہے کہ وہ طغیانِ شر کی حمایت نہ بھی کریں تب بھی اس کی مخالفت سے باز رہتے ہیں۔

ہمیں اس بات کا حق تو نہیں پہنچتا کہ دوسرے انسانوں کو بحیثیتِ انسان حقیر سمجھیں کیونکہ ہم ان کے دروں ترین 'راز' سے واقف نہیں۔ مگر ہمیں اس ''حیوانِ کبیر'' (یہ وہ اصطلاح ہے جس سے سیموں ویل نے معاشرے کو موسوم کیا ہے) سے نفرت کرنے کا پورا حق حاصل ہے اور اس کی ان آرا سے بھی، جنھیں وہ اپنے غیر شخصی سفلہ پن کے ذریعہ ہم پر ٹھونسنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

مقامِ حیرت ہے کہ ایک ایسے دور میں جو کلبیت شعار فرض کیا جاتا ہے، مروّجہ اخلاقیات کے علمبردار جو 'مساوات' اور 'سماجی انصاف' کی باتیں کرتے ہیں بزعمِ خویش اتنے ہی پارسا ہیں جتنے سترہویں صدی کا کوئی (Puritan) یا انیسویں صدی کا کوئی مشنری۔ ان میں خود پر تنقید کرنے کی

زیادہ ہمت ہونا چاہیے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس جدید (Puritanism) نے پرانے رویّے کا بے معنی روزمرّہ اور محاورہ بھی فوراً اپنا لیا ہے۔ مثلاً انسانوں میں دولت کا فرق ''نازیبا'' ہے اور یہ تصور ''ناشائستہ'' ہے کہ کچھ لوگ وہبی طور پر دوسروں سے بہتر ہوتے ہیں۔ یہ اور اس قسم کی اور بہت سی اصطلاحات کے پیچھے کسی مذہبی تحریک یا عقیدے کا ہاتھ نہیں۔ یہ تو ایک تاریخی رجحان ہے جو بہت سے خول چڑھا کر اور کئی ناموں کی آڑ لے کر کام کرتا رہا ہے۔ اس کا اصلی روپ شاید ہی کبھی بے نقاب ہوا ہو۔ جو لوگ اس کے آلۂ کار بنتے ہیں انھیں خود اس کی خبر نہیں اور ان کی بے خبری اس کے لیے مفید ہے۔ ایک ایسا شخص جو شعوری طور پر لوگوں کو دھوکا دیتا ہے اور قصداً انھیں گمراہ کرتا ہے سیاست میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص اگر خود یقین نہیں رکھتا تو دوسروں کو یقین کیونکر دلا سکتا ہے اور اگر خود ہی کسی بات کا قائل نہیں تو دوسروں کو کیا قائل کرے گا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ اس مبہم لیکن قوی رائے عامہ میں پوری طرح شریک ہے یا نہیں جس نے لوگوں کے قلب و ذہن پر تسلط جما رکھا ہے۔ ازمنۂ ایمان میں تمام آرا ایک مطلق اور غیر متغیر اصول کی روشنی میں ترتیب پاتی تھیں۔ اب اس اصول پر سے ایمان اٹھ جانے کے بعد لوگوں کے قلب و ذہن رائے عامہ کے دھارے میں بہنے لگے ہیں۔

جو بے معنی معتقدات آجکل زور پکڑتے جا رہے ہیں وہ کبھی اتنے مقبول نہ ہوتے اگر انسانوں کے اندر ایک خلا کا احساس نہ ہوتا جسے بھرنا ضروری ہے، ایک لاعلمی جو تیقنات کا مطالبہ کرتی ہے خواہ جعلی اور مہمل ہی کیوں نہ ہوں۔ انسان جاننا چاہتا ہے۔ اگر اسے حقیقی علم میسر نہ ہو تو وہ باطل ہی کو نگل لیتا ہے اور اسی کو علم بنا لیتا ہے۔ لیکن یہ صرف ان کے ساتھ ہوتا ہے جو خاک و باد کی عمومی اور روزمرہ سطح پر حق سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اس سے برتر کسی سطح پر بھی حق سے آشنا ہونے کی امید کھو بیٹھتے ہوں ــــ وہ پردے جن کے پیچھے حیاتِ انسانی کے نارمل حقائق ان سے اوجھل ہیں، بعض دیگر چیزیں بھی ان سے چھپائے رکھتے ہیں۔ اس قسم کے پردے صرف حفاظت ہی نہیں کرتے بلکہ بہت کچھ زندگی سے خارج بھی کر دیتے ہیں۔ یہ ہمیں ایک خوابوں کی دنیا میں محبوس کر دیتے ہیں جہاں حماقت کو حکمت اور حق کو باطل دیکھنا آسان ہوتا ہے اور ان کا فرق کوئی بتانے والا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس فرق کو دیکھنے کے لیے جو چمکدار روشنی درکار تھی وہ تو کب کی بند ہو چکی۔ ایسی کمزور مخلوق سے کیا توقع رکھی جا سکتی ہے اگر اسے کھلے میدانِ عمل میں لا پھینکا جائے،

ان پالتو جانوروں کی طرح جنھیں اپنا دفاع خود کرنے کے لیے جنگل میں تنہا دھکیل دیا گیا ہو۔ وہ کسی بھی صورت میں حق کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ دریں حالیکہ جو پناہ گاہ انھیں ان کو اپنی حماقتوں اور فطرت کی اندیکھی قوتوں سے بچانے کا کام کر رہی ہے وہ اس قدر کمزور ہے کہ کسی وقت بھی ڈھے سکتی ہے۔ اس کا وجود ہی نام نہاد ترقی یافتہ ممالک میں دولت کی فراوانی اور خوشحالی کی ضمنی پیداوار ہے۔ وقت آنے پر پتہ چلے گا کہ یہ مہربان معاشرہ جب دولت سے محروم ہوگا تو فرد کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔

اس معاشرے کا علانیہ مقصود تھا زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مسرت کا حصول! آج کل کی صورت حال، جو افسوس ناک تو ضرور ہے مگر غیر متوقع نہیں، یہ ہے کہ اس معاشرے کو اپنے اس مقصد میں جو اس کا جواز وجود ہے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ انسانوں میں شاید تشویش کی ایک غیر متغیر صلاحیت کارفرما ہے۔ جتنا یہ معاشرہ اپنے شہریوں کو ان تمام ذمہ داریوں اور پریشانیوں سے بے فکر کرتا جاتا ہے جو عام طور پر انسانی معاملات سے لگی رہتی ہیں، اتنا ہی لوگ اپنی مذکورہ صلاحیت تشویش کو غیر اہم گھٹیا اشیا پر پریشان ہونے کے لیے صرف کرنے لگتے ہیں، وسیع پیمانہ پر رائی کو پہاڑ بنانے لگتے ہیں اور انھیں ایسے مسائل پر ''اعصابی زدگی'' کے دورے پڑنے لگتے ہیں جن کو آج کے مقابلے میں کہیں زیادہ کٹھن حالات میں زندگی بسر کرنے والوں نے بھی کبھی درخورِ اعتنا نہ جانا تھا۔

برطانیہ اور امریکہ کے وہ لوگ جو دوسری عالمی جنگ کا زمانہ دیکھے ہوئے ہیں ان کی یاداشت میں آزمائش اور خطرات کا وہ دور اُن کی زندگی کا سب سے پُرمسرت دور تھا۔ یہ چیز کس بات کو ظاہر کرتی ہے؟ خوشی ایک گریزاں کیفیت ہے جسے قانونی ضابطوں کے ذریعہ نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ اس معاملے میں انسان اس بچے کی طرح ہے جو دنیا جہاں کے تحائف پا کر بھی ضد کرے کہ جس چیز کو اس کا جی چاہ رہا ہے وہ اس ڈھیر میں موجود نہیں۔ یہ امر ان لوگوں کو دل برداشتہ کرنے کے لیے کافی ہے جو سب کو خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ آسانی سے ہار نہیں مانتے۔ دورِ ملوکیت میں اینگلو سیکسن لوگ سب سے زیادہ ہٹ دھرم مشنری ثابت ہوئے تھے اور یہ جذبہ اب بھی باقی ہے (خصوصاً بائیں بازو کے حلقوں میں) مگر اب اس کا رخ اندر کی طرف، اپنے معاشروں کی سمت ہو گیا ہے۔ نئی اخلاقیات یا نئے تصور و معیارِ انسانی کا اس شد و مد اور برخود غلط انداز سے پرچار کیا جاتا ہے جو عیسوی

کلیسا کے قدرے بدعتی ذیلی فرقوں کے علمبرداروں کا خاصا تھا جب وہ ننگ دھڑنگ غیر عیسائی 'کافروں' کو یہ سمجھانے نکلتے تھے کہ ان کے حق میں بہتر کیا ہے۔ صرف جگہ اور لباس بدل گئے ہیں۔

جو شخص اس تمام کے باوجود ان چیزوں کو ماننے میں دشواری محسوس کرتا ہو جو جدید اخلاقیات کے علمبرداروں کے لیے بدیہی ہیں اور آج کے فیشن کے مطابق 'نارمل' بننے سے قاصر ہو اسے نفسیاتی علاج کا محتاج سمجھا جاتا ہے۔ ہم روسی حکام کو اس بات پر ہدفِ تنقید بناتے ہیں کہ وہ اپنے باغیوں کو ذہنی امراض کے ہسپتالوں میں قید کر دیتے ہیں کہ ان کے لیے ہر وہ شخص تھوڑا سا پاگل ہے جو ''اشتراکی اخلاقیات'' کا مقلد نہیں۔ سیموں ویل کا ''حیوانِ اکبر' ایسا خدا بن چکا ہے جس کا منکر دیوانہ ہے اور اس معنی میں 'غیر سماجی' (Anti-social) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ حقیقت سے کٹ چکے ہیں۔ مغرب میں انقلاب کی جگہ ''تدریج'' رائج ہے لہٰذا وہاں معاملات اتنے تیکھے اور واضح نہیں ہیں وگرنہ سمتِ سفر ہماری بھی وہی ہے اور طبِ نفسی (Psychiatry) سماجی مطابقت کا پرچار کرنے میں بھرپور حصہ لے رہی ہے۔

اصولاً تو طبیب نفسی اپنا منصب صرف یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کو اس ماحول میں ہر ممکنہ حد تک خوشگوار زندگی گزارنے میں مدد دے جس میں وہ موجود ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ کوئی اخلاقی فیصلہ نہیں دیتا کہ اچھا کیا اور برا کیا ہے۔ اسی طرح جیسے موٹر گاڑیوں کے مستری کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ مرمت ہو جانے کے بعد موٹر گاڑی کس رخ میں چلائی جائے گی۔ خرابی یہ ہے کہ انسانی صورت حال ہمیں اس قسم کی غیر جانبداری کی اجازت نہیں دیتی۔ طبیب نفسی انسان ہوتے ہیں اور ان میں بھی انسانی افعال کو اخلاقی سیاق وسباق میں دیکھنے کا وہی رجحان پایا جاتا ہے جسے دور کرنا ممکن نہیں، نیز ان کے مریض بھی انسان ہوتے ہیں موٹر کاریں نہیں۔ ان دونوں کا فرق نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ موٹر گاڑیاں اپنی سمت کا چناؤ نہیں کرتیں جبکہ انسان کرتے ہیں خواہ جزوی اور محدود معنی ہی میں ہو۔

انسان کو ایک بگڑے ہوئے معاشرے یا واصل بہ تباہی معاشرے سے تطابق کی ترغیب دینا درست ہے یا نہیں؟ یہ وہ سوال ہے جس سے طبیب نفسی حتی الامکان بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے قدری فیصلے کرنا پڑتے ہیں اور بیشتر طبیب نفسی ایسے فیصلوں کو اپنے دائرہ کار سے بارہ پتھر باہر رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ مگر یہ تصور رکھنا ہی اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ یہ لوگ انسانی فطرت سے نرے نابلد ہیں۔

ہمارے نزدیک قابلِ تعریف کون ہے؟ وہ غلام جو حالات سے سمجھوتا کر کے غلامی کی زنجیروں میں مست رہتا ہے یا وہ غلام جو فرار ہو کر آزاد انسان بن جاتا ہے؟ زیادہ تر لوگ فرار ہونے والے کی حمایت کریں گے مگر طبیب نفسی نے خود کو اس کام کے لیے وقف کر رکھا ہے کہ 'فراریت' کے ہر رجحان کے خلاف جدوجہد کرے خواہ یہ رجحان کوئی بھی شکل اختیار کرے اور لوگوں کو اپنے دور کے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کا مشورہ دے، محض اس لیے کہ یہ حالات موجود ہیں، جیسے ایک مہیب برفانی تودے (Avalanche) کے راستے میں کھڑے ہوئے آدمی کو اپنی صورت حال سے سمجھوتے کا مشورہ دیا جائے کیونکہ یہ صورت حال بھی یقیناً موجود ہے اور کہا جائے کہ اس برفانی تودے سے مطابقت پیدا کر کے اِسے خود کو کچلنے کی اجازت دے دو کیونکہ اس کی زد سے نکلنے کی ہر کوشش 'فراریت' کا عمل ہوگا۔ جو لوگ تغیرِ مسلسل کی اقلیم سے باہر کسی اصول پر ایمان نہیں رکھتے ان کے نزدیک حقیقت صرف اتنی ہی ہے جو کسی خاص لمحہ میں واقعتاً موجود ہے اور جو اس لمحہ میں موجود ہے وہی سب کچھ ہے۔ مراتبِ حقیقت کا خیال ہی اس ذہنیت کے لیے اجنبی ہے۔ حالانکہ وہ مانتے ہیں کہ حالتِ بیداری نیند سے زیادہ حقیقی ہے اور واہمہ (Hallucination) اشیا کی واضح دید سے مختلف ہے۔

لوگ جس چیز کو حقیقت پسندی اور جرأت سمجھتے ہیں وہ درحقیقت بزدلی اور بے بسی کا احساس ہے۔ جب کسی ناگہانی مصیبت کا تدارک نہ ہو سکے تو اسے مفید قرار دے کر اپنی معذوری کو خوبی ثابت کرنے لگتے ہیں۔ حقیقت پسندی کا رویہ تو امتیاز اور جانچ پرکھ کا متقاضی ہوتا ہے۔ عام سادہ سطح پر ہر ایک کو معلوم ہے کہ خوش گوار اور ناگوار میں کیا فرق ہے اور ناگوار اور تکلیف دہ کو اگر برداشت کرنا پڑے تو کیا اس سے ہم اسے اس کے علاوہ کچھ اور سمجھنے لگیں گے۔ اسی طرح اگر ہم جدید دنیا کے باطل، بدنما اور شرفِ انسانی کے لیے تباہ کن پہلوؤں سے صرف اس لیے روگردانی کریں گے کہ یہ موجود ہیں اور ہم ان کا کوئی حل نہیں سوچ پائے تو اس رویے کا مطلب یہ ہوگا کہ تکالیف تو موجود تھیں ہی اب تکلیف کو بطور تکلیف شناخت کرنے کی خلقی صلاحیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

مصنوعی دنیا گھڑنے والے اس کوشش میں رہتے ہیں کہ ان کی خود ساختہ دنیا میں سچائی کی کوئی رمق داخل نہ ہونے پائے اور اس کوشش میں انھیں سب سے زیادہ خطرہ جذباتی اضطراب سے محسوس ہوتا ہے۔ تیز رفتار تبدیلی انسان کو بے چین اور مضطرب کر دیتی ہے اور جب ہر چند سال بعد اپنے ماحول میں نت نئی تبدیلیوں سے سمجھوتہ کرنا پڑے تو بہت سے لوگ مضمحل ہو جاتے ہیں اور

مسکرانا تک بھول جاتے ہیں دوسرے یہ کہ ہم میں سے ہر کسی کو رنج والم کا سامان کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے پیارے مرجاتے ہیں اور ایک دن وقت آنے پر ہمیں بھی مرجانا ہے۔ توقعات پوری نہیں ہوتیں، عزائم اور منصوبے حالات کے ہاتھوں ناکامی کا شکار ہوجاتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض لوگ دوسروں کے ساتھ زیادتی کرنے کے بعد یا اپنے نفوس کی قباحتوں کو دیکھ کر خود کو ملامت کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک حل مسکن یا دافع اضمحلال ادویہ کی شکل میں تلاش کیا گیا ہے۔ چنانچہ بہت سے انسانی تجربات جو پہلے انسانی زندگی کا لابدی جز سمجھے جاتے تھے اب طبی مسائل بن گئے ہیں اور ان کا 'علاج' کیا جانے لگا ہے۔ محبوب شوہر کی یاد میں تڑپنے والی بیوہ یا شہری آبادیوں پر نیپام بم گرا کے متاسف ہونے والا ہوا باز دونوں ہی ذہنی مریض شمار ہوتے ہیں۔ پہلے تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ احساسِ جرم بھی بالواسطہ سہی، مگر حقیقت اور تجرباتِ انسانی پر لاگو ہونے والے قوانین کو سمجھنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔ مگر اب یہ ایک مرض گردانا جاتا ہے جس کا علاج ہونا چاہیے۔

موت بہرحال ناقابلِ علاج ہے اور رہے گی۔ دکٹورین دور میں بسترِ مرگ کے گرد ہونے والے جذباتی مناظر یا نسبتاً کم شائستہ لوگوں میں پائی جانے والی سوگ کی رسومات ہمیں سراسیمہ ضرور کردیتی ہیں لیکن موت بذاتہ ایک ایسی حقیقت ہے جو انسان کی حیثیت اور اصلیت کے بارے میں بہت سے انکشافات کرتی ہے۔ ایسے انکشافات کہ انھیں نظرانداز کرنا یا فراموش کرنے کی کوشش کرنا اس اہم ترین بات سے بےخبری کے مترادف ہے جو بحیثیت ایک جیتی جاگتی مخلوق کے، ہمیں اپنے بارے میں معلوم ہونی چاہیے۔

اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو موت سے ہمکنار ہوتے دیکھنا اور اس موقع پر موجود ہونے سے انسان اپنے بارے میں یہ جان لیتا ہے کہ وہ خود کیا ہے اور اگر اس میں ذرا بھی سمجھ بوجھ ہو تو وہ اس سے ایسے نتائج اخذ کرسکتا ہے جو اس کے ہر خیال اور ہر عمل کو کسی نہ کسی طرح ضرور متاثر کریں گے۔ یہی وجہ تھی کہ اموی خلیفہ ولید اوّل جو انگشتری پہنے رہتا تھا اس پر مندرجہ ذیل الفاظ کندہ تھے: ''ولید، تجھے ایک دن مرنا ہے۔''

ہم کیا ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے، یہ بات ہم اس وقت تک نہیں سمجھ پائیں گے جب تک ہم اپنے جسم و جان اور قلب و ذہن میں یہ نہ جان لیں کہ ہم فانی ہیں اور موت اس دن سے ہمارے ساتھ قدم ملا کر چل رہی ہے، جس دن ہم نے دنیا میں پہلا سانس لیا تھا۔ یہ صرف اسلام ہی میں نہیں

ہے کہ مرد دانشمند یہ سوچ کر سونے لیٹتا ہے کہ شاید اسے صبح دیکھنی نصیب نہ ہو اور ہر صبح کا خیر مقدم اس علم کے ساتھ کرتا ہے کہ ممکن ہے وہ اس کی شام نہ کر پائے۔ وہ لوگ جو اس آگہی میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کے شب و روز میں ایک ذائقہ اور لطف ہوتا ہے جو ان تمام لوگوں کو نصیب نہیں ہوتا جو اس حقیقت سے نظر چراتے ہیں۔ ایسے لوگ جانتے ہیں کہ انسان ہونے کا مطلب کیا ہے؟ دوسرے لوگ اس سے ناآشنا ہیں۔

آج کل حیاتِ انسانی کے تکلیف دہ اور تاریک پہلوؤں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کی کوشش دیکھنے میں آتی ہے جس میں ان پہلوؤں سے اوپر اٹھ جانے کی بجائے سارا زور اس پر ہے کہ یا تو ان کا خاتمہ کر دیا جائے ــــ جو کہ ناممکن ہے اس لیے کہ یہ ماہیتِ اشیا میں شامل ہیں ــــ یا پھر تجاہلِ عارفانہ کے طور پر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ موجود ہی نہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگوں کے لیے ان حالات کو قبول کرنا ممکن تھا کیونکہ ان کے لیے زندگی ایک وسیع تر سیاق میں واقع تھی۔ وہ جانتے تھے کہ وہ رنج و محن اور خساروں کے منظر نامے میں کتنے ہی مبتلا کیوں نہ ہوں، وہ از روئے فطرت اس میں پوری طرح غرق نہیں ہیں۔ ان کا تجربہ ان کو یہ سبق دیتا تھا کہ سکون اور کمال کی راہیں کسی اور سمت میں واقع ہیں اور ایمان سے انھیں یہ تسلی ملتی رہتی تھی کہ ان جہات کے علاوہ جو انھیں محصور کیے ہوئے ہیں اور بھی جہات ہیں اور بھی عالم ہیں۔ اس کے برعکس فی زمانہ اکثر لوگ ایسے مقام پر پھنسے ہوئے ہیں جس کا کوئی عالمِ دگر نہیں، ایسے جنگلی درندوں کے ساتھ مقید ہیں جو انھیں نوچ ڈال رہے ہیں اور جہاں سے فرار کی کوئی راہ موجود نہیں۔ اس صورت حال میں زندہ رہنے کے لیے اگر انھیں نشہ پلانے کی ضرورت پڑتی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے!

یوں ہم ایک دوری استدلال میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔ جس قدر ہم حالتِ انسانی کی تلخ حقیقتوں سے خود کو خول بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چاہے یہ خول کتنا ہی عارضی کیوں نہ ہو، اسی قدر ہماری دنیا غیر حقیقی بنتی چلی جاتی ہے اور حق سے مزید دور ہوتی جاتی ہے۔ دیگر جہات کی آگہی جس کے ذریعے ہم آزادی حاصل کر سکتے ہیں، ہماری دسترس سے باہر ہو جاتی ہے۔ ایک مصنوعی دنیا میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی، کیونکہ خدا کے وجود کی طرف اشارہ کرنا اور اس کی یاد دلانا حقیقتوں کا کام ہوتا ہے افسانوں کا نہیں اور ایسی دنیا میں یہ خیال ہی ناقابلِ تصور ہے کہ کوئی خیر ــــ کوئی مسرت یا جزا ــــ یا کوئی روشنی اس حباب سے باہر بھی مل سکتی ہے جس میں ہم رہتے ہیں۔ اس

بلبلے کے بعد ہم صرف تاریکی اور ایک خوف ناک خلا کا تصور کر سکتے ہیں جو سیاروں کی درمیانی فضائے بسیط کے مانند سیاہ ہے: ہم اس کا سامنا کرنے سے کتراتے ہیں اور اس سے منہ چھپا کر موت کا انتظار کرتے ہیں۔

جب کوئی شخص دیوانہ ہو جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کا ''حقیقت سے رابطہ کٹ گیا ہے''۔ یہ ایک مناسب تعریف ہے گو کہ اس میں اس اختلاف رائے کی گنجائش موجود ہے کہ حقیقت سے کیا مراد ہے؟ ضروری نہیں کہ ہر ماہر نفسیات ایک مقررہ اور بلا اعتراض تسلیم شدہ صورت حال سے سمجھوتے کو فرزانگی کا نام دیتا ہو۔ برونو بیٹل ہائم نے (جو خود بھی نازی کیمپوں سے زندہ بچ نکلنے والوں میں شامل ہے) نازی مشقت کیمپوں میں انسانی رویوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے وہ اپنی کتاب ''قلبِ آگاہ'' *The Informed Heart* میں اس عام رجحان کا ذکر کرتا ہے جو اس حقیقت کی تردید کی شکل میں سامنے آیا ہے کہ انسانی حالات کی بڑھتی ہوئی میکانکیت نے کسی بنیادی مسئلے کو جنم دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

منشیات کے دھنی کی طرح ہمارا معاشرہ بلا سوچے سمجھے زندگی کو زیادہ سے زیادہ میکانکی اور مشینی بنانے میں تیزی سے مصروف ہے، اس توقع کے ساتھ کہ موجودہ ٹکنالوجی سے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ وہ ٹکنالوجی میں اضافہ اور توسیع سے حل ہو جائیں گے۔ اس معاملے میں ہمارا طرزِ عمل اس شرابی جیسا ہے جو پچھلے خمار کی متلی سے نجات پانے کے لیے شراب کا ایک نیا دور چلا لیتا ہے۔

برونو مزید لکھتا ہے:

جدید انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ دو چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنے سے قاصر ہے ــــ اپنی آزادی اور انفرادیت کی قربانی یا ٹیکنالوجی کی مادی آسائشوں سے دست برداری ــــ میری نظر میں یہی ہمارے دور کی سب سے بڑی کش مکش ہے۔

مندرجہ بالا بیان کا مقتضیٰ یہ ٹھہرا کہ انسان انتخاب کے امکان سے آگاہ ہے۔ لیکن وہ طوفانی رفتار جس سے ہم اپنی ایکسپریس ٹرین میں آگے بڑھ رہے ہیں، گرد و پیش کے بدلتے ہوئے ماحول کے خدوخال جس طرح دھندلکے میں گم ہو رہے ہیں اور جس جبریت پسند انداز میں ان حالات کو قبول کر لینے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے، یہ سب عوامل مل کر اس بات کا ادراک ہی مشکل کیے دے رہے ہیں کہ انتخاب کرنا ممکن ہے یا کبھی رہا تھا۔ بہر صورت، ہمارے عہد میں ایک عام انسانی رجحان پایا جاتا ہے جو آج سے پہلے کبھی اتنا عیاں نہیں تھا۔ اسے ہم چت بھی میری پٹ بھی میری

سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ ایقان کہ انسان بلا کچھ قربانی دیے جدید آسائشوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ نظریۂ ارتقا اور خوش فہمی کے ملاپ سے تصورِ ترقی یا تقدم نام کی جو حرامی اولاد جنم لیتی ہے وہ اس قسم کے یقین کو پروان چڑھانے میں مددگار بنتی ہے۔ یہ فوراً فرض کرلیا جاتا ہے کہ جدید دنیا کے تمام فوائد ــــ آرام و آسائش، مادی خوشحالی، بہت سی طبعی آفات سے بچاؤ، انسانی تجربے کی بھرپور نوعیت وغیرہ ــــ ہمارا پیدائشی حق ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بالغ ہونے پر ہر مرد و زن کو چند حقوق خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں۔

تعلیمی اداروں میں معاصر سائنس کے فرضیے اس طرح پیش کیے جاتے ہیں گویا وہ مفروضے نہیں بلکہ مسلمہ حقائق ہیں۔ بچوں پر اس ضمن میں بہت سے گمراہ کن سبق ٹھونسے جاتے ہیں۔ ان میں سے بدترین مفروضہ یہ فسانۂ مداہنت ہے کہ عہدِ حاضر بنی نوع انسان کے 'سن بلوغت' کی نمائندگی کرتا ہے۔ تصویری کتب میں ہمارے بالدار آباؤ اجداد کو آگ دریافت کرتے دکھایا جاتا ہے۔ ہمارے بچگانہ مگر ہونہار مورث ابتدائی مشینیں اور آلات ایجاد کرتے نظر آتے ہیں اور ہم جود انا بھی ہیں اور زیرک بھی، طوفانی رفتار سے سفر کرتے ہوئے اور ایک فردوسِ ارضی کی طرف بڑھتے ہوئے دکھائے جاتے ہیں۔ اس میں محذوف ہے مغرب کے انسان کا وہ تصور جو خلافِ مصلحت ہونے کی وجہ سے صاف بیان نہیں ہوتا مگر جس کی طرف کنایتاً اشارہ ہو جاتا ہے ــــ مغرب کا انسان، علم اور تمدن کے تحائف ان کم نصیب اقوام تک پہنچاتا ہوا جنھیں یہ دولت میسر نہ ہو سکی۔

ایجادی صلاحیت کو ذہانت اور فضیلت دونوں کی کسوٹی سمجھ لیا گیا ہے اور تاریخ کے ایک خاص لمحے میں موجود اور ایک خاص انبوہ انسانی کی خصوصیات کو پوری بنی نوع انسان کی ''ارتقا یافتہ'' حالات سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ یہ بات بھلا دی گئی ہے کہ ایک رُخے پن کو اپنانے کا ہرجانہ بہت بڑا ہے اور اسے صرف ان بہت سے اوصاف کی بھینٹ دے کر حاصل کیا جا سکتا ہے جنھیں کبھی انسان اور حیوان کے درمیان حدِ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود انسان کی حقیقت نہیں بدلتی۔ انسان بہرحال انسان رہتا ہے۔ اسے دو اچھی چیزوں میں سے ایک کا چناؤ کرنا پڑتا ہے اور بیک وقت دونوں سے لطف اندوز ہونا اس کے بس سے باہر ہے۔ ایک کے حصول کے لیے اسے آخر کار دوسری کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ اسے ایک حقیر، بے وقعت شے کے لیے اپنے قیمتی ورثے سے دستبردار ہونے کو کہا جائے، حقیقت کے بدلے خواب اور اشرفیوں کے مول کباڑ کا

سودا کرنے کی دعوت دی جائے۔ دنیا جو کچھ ہمیں دے سکتی ہے از روئے فطرت ہی محدود ہے اور ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم اس سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسے کوئی آثار نہیں جن سے یہ پتہ چلے کہ آج کا انسان مکافات کے قوانین سے آزاد ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

چنانچہ اب ہمیں کائیاں اور گھاگ تاجر بننا ہے۔ اپنی خرید و فروخت کے مال کا چناؤ احتیاط سے کرنا ہے، ان لوگوں سے خبردار رہنا ہے جو بلا معاوضہ ہمیں کچھ پیش کرنے پر تیار ہوں اور اپنا مال تب نکالنا ہے جب رقم ہاتھ میں آجائے۔ بیٹل ہائم جیسے شخص کو جو قید و بند کے تجربات سے گزر چکا ہے آزادی کی وقعت کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی آزادی کے ذرہ برابر حصہ سے بھی اس وقت تک دستبردار ہونے پر قطعاً تیار نہیں ہوتے جب تک اس کے بدلے میں پیش کی جانے والی شے کی قدر و قیمت کا بے شک و شبہ تعین نہ ہوجائے نہ ہی وہ اپنا حقِ انتخاب آسانی سے چھوڑنے پر آمادہ ہوں گے، خواہ چھوٹے چھوٹے معاملے ہی میں کیوں نہ ہو۔

معاصر معاشرے اس نظریہ کے تحت کام کرتے ہیں کہ انسان کو صحیح انتخاب کی مکمل آزادی ہونا چاہیے البتہ غلط انتخاب سے اسے ہر قیمت پر باز رکھنا ہوگا کیونکہ یہ نہ صرف اس کے اپنے لیے بلکہ دوسرے افراد کے لیے بھی مضر ثابت ہوسکتا ہے۔ اب اسے کیا کہیے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ اکثر غلط انتخاب کرنے پر مصر رہتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے بہی خواہ مفادِ عامہ کے پیش نظر انتخاب کا حلقۂ عمل تنگ اور غلطی کرنے کے مواقع محدود کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ اس طرح یہ دامِ ہمرنگ زمین افراد کو اپنی گرفت میں لیتا چلا جاتا ہے۔ ایک دم سے نہیں کہ اس طرح شکار آزاد ہونے کے لیے بے تحاشا ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے بلکہ رفتہ رفتہ، قدم بقدم، سال بہ سال۔

اس پھندے میں گرفتار ہونے سے گریز کی کوئی خوش گوار یا کم از کم گوارا صورت موجود ہے یہ کہنا دلیل کم نظری ہوگی۔ موجودہ صورتِ حال میں ہمارے پاس صرف دو بلاؤں میں سے ایک کا چناؤ کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ سفید اور سیاہ کے درمیان انتخاب کی نہیں۔ عہدِ جدید پر اساسی تنقید کے لیے جن معتقدات پر یا نظریات پر اعتراض کرنا ضروری ہے انھی نظریات کی بدولت دیگر چیزوں کے علاوہ، طب کے میدان میں پیش رفت ہوئی، بہت سے کاموں اور انسانی سرگرمیوں میں سہولت فراہم ہوگئی اور باعتبار کمیت و مقدار ایسی بھرپور زندگی حاصل ہوئی جو پہلے کبھی ممکن نہ تھی۔ دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اسی صدی میں جس پیمانے پر قتلِ عام اور بربریت کی مثالیں

دیکھنے میں آئی ہیں ان کی نظیر ملنا محال ہے۔ لیکن اس حقیقت کو غیر متعلق قرار دے دیا جاتا ہے اور ایسے واقعات کو محض حادثات گردانا جاتا ہے کہ جن سے اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم مستقبل میں محفوظ رہیں گے۔ اسی طرح دورِ جدید پر تنقید کرنے والے کا منہ یہ کہ کر بند کیا جاسکتا ہے کہ کیا اسے پرانے زمانے کی طرح دنیا میں جنم لینے والے نصف بچوں کا شیر خوارگی ہی میں لقمۂ اجل بننا منظور ہے؟ اور جو اس سے بچ نکلیں انھیں وہ زندگی کی زیادہ تر مسرتوں سے محروم دیکھنا چاہتا ہے۔

ہم کیا چاہتے ہیں اور کیا نہیں چاہتے، مسئلہ زیرِ بحث سے اس سوال کا کوئی تعلق نہیں۔ ہماری خواہش ہی پر موقوف ہو تو ہم دنیا کے ہر ممکنہ بلکہ سچ پوچھیے تو ناممکن تحفے اور خوبی سے لطف اندوز ہونا چاہیں گے مگر ہم حقیقت کے دائرے میں محصور ہیں اور موجود واقعی اور قابلِ عمل صورتوں تک محدود۔ جو لوگ ناممکنات کے حصول کے لیے سرگرداں رہتے ہیں وہ آخر الامر اپنا تھوڑا بہت ٹھوس اور مفید سرمایہ بھی گنوا بیٹھتے ہیں۔ شام ڈھلے ان کی جھولی میں صرف خواب اور واہمے رہ جاتے ہیں جو آکاش بیل کی طرح اپنے پالنے والے کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

نقاد سے اکثر یہ استفسار کیا جاتا ہے کہ آیا وہ گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف لوٹانا چاہتا ہے، جیسے وقت کا دھارا پلٹ دینا یا بوڑھے کو جوان کر دینا اس کے اختیار میں ہو۔ ہم ماضی سے سبق تو سیکھ سکتے ہیں، اس میں لوٹ کر جا نہیں سکتے۔ جو سماجی نظام یا رہن سہن کے سانچے اپنا وقت پورا کر چکے، متروک ہو چکے، انھیں نئے سرے سے واپس نہیں لایا جاسکتا لیکن وہ ایک کسوٹی ضرور ثابت ہو سکتے ہیں، انسان کے لیے نشانِ راہ بن سکتے ہیں اور ایسے نشان، ایسی کسوٹیوں کے بغیر ہماری حالت ان بچوں سے کسی طور بہتر نہیں جو تنہا جنگل بیابان میں کھو گئے ہوں۔ بہر کیف وقت کو واپس لوٹانے والا اعتراض موجودہ دور کے اس رجحان کی سب سے بڑی مثال ہے جو کہتا ہے کہ جس تنقید میں کوئی فوری تدارک یا حل نہ پیش کیا جائے اسے بے معنی قرار دے کر رد کر دیا جائے۔ بایں ہمہ مخدوش بنیادوں پر اٹھائی جانے والی عمارت ہر حال میں ڈھے جائے گی۔ چاہے معمار اس کی جگہ نئی عمارت بنانے پر تیار ہوں یا نہ ہوں اور نجی زندگی میں تو انسان کو اب بھی اپنے غلط فیصلوں کو پہچان کر ان پر پچھتانے کا حق حاصل ہے، خواہ پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔

اس سے پہلے کہ موقع ہاتھ سے نکل جائے ہم اپنے ماضی سے بہت سی ضروری باتیں سیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ہماری خود پسندی کی مقدار میں قدرے تخفیف ہو جائے۔ اس ماضی میں نسل در نسل

مدتوں تک اپنی ذات اور اپنی دنیا کی جس تصویر کے ساتھ لوگ جیتے تھے اور جسے لے کر کوچ کرتے تھے وہ اتنی حقیقی اور اتنی ہی غیر متغیر تھی جتنا اردگرد کا طبعی ماحول۔ اس تصویر کا رنگ روپ ہر مقام کے حوالے سے مختلف تھا جس طرح ہر قوم کی زبان اور اسلوب جدا ہوتے ہیں مگر اپنے اساسی جوہر کے اعتبار سے یہ ایک واحد عالمگیر تصور تھا اور اگر اسے ہمارے معاصر تصورِ اشیا سے موازنے میں دیکھا جائے تو اس تصور کے فروعی اختلافات سرے سے درخورِ اعتنا ہی نہیں ہوتے۔ آج مغرب کے بیشتر لوگوں اور دنیا کے دیگر علاقوں میں انسانوں کی ایک روز افزوں نفری کو یہ تصور باطل نظر آتا ہے صرف اس لیے کہ یہ طبعی، مادی معائنہ اور تجربہ پر مبنی معلوم نہیں ہوتا۔

ہم راستی پر ہیں اور ہمارے علاوہ تمام گزرے ہوئے لوگ غلطی پر تھے۔ آیئے اس مفروضے کے مدلولات اور کنایات کا جائزہ لیں۔ اگر ابتدائے آفرینش سے لے کر کل تک دنیا کی تمام نسلوں کے افراد کی غالب اکثریت اپنے انتہائی بنیادی عقائد کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھی اور اگر ان لوگوں نے اپنی زندگیاں فریب اور مغالطوں کی نذر کر دیں تو ہمارے پاس یہ فرض کرنے کا قطعاً کوئی معقول جواز نہیں رہ جاتا کہ بنی نوع انسان اب یا آئندہ کبھی صحیح سوچ سکے گی۔ یہ خیال بعید ترین از امکان بلکہ محال ہے کہ قرنہا قرن کی توہم پرستی اور جہالت کے بعد یہ احمق مخلوق یک لخت دانا ہوگئی کیونکہ فرتھجوف شواں کے بقول ''وہ ہستی جو فطرتاً ہی مہمل ہو اپنا مہمل پن دور کرنے کا امکان کہاں سے پیدا کرے گی۔'' بنی نوع انسان کے روایتی عقائد کے خلاف صادر ہونے والا ہر حرفِ استہزا خود ہمارے پائے استدلال کو مجروح کرتا ہے اور ہم کسی بھی میدان میں صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز بہت غور کرنے کی ہے کہ ہم گزرے وقتوں کے لوگوں کی طرح کے انسان ہیں۔ ہمارے پاس کوئی چھٹی حس یا کوئی ایسی عقلی قوت موجود نہیں جو ان کو بھی حاصل نہ رہی ہو۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس نکتے کو تسلیم کر کے جواباً یہ طرزِ فکر اختیار کرتے ہیں کہ اوّلاً تو حق ہے ہی کہاں کہ اس کے جاننے کی جستجو کی جائے اور اگر ہے بھی تو انسان کی پہنچ سے باہر تھا اور رہے گا لہٰذا اسے صرف ایک چیز پر قناعت کرنا چاہیے جسے وہ یقینی طور پر جانتا ہے ــــ اس کا اپنا داخلی تجربہ ــــ عقلِ انسانی سے جبراً استعفا دلوا کر اسے معزول کرنے کی اس سے بھرپور صورت اور کیا ہوگی! ان فلسفیوں نے اپنے لیے پاتال کا وہ نہاں خانہ تلاش کیا ہے جہاں نہ رعد کی گرج تھرا سکتی ہے نہ بجلی کی چمک نگاہ کو خیرہ کر پاتی ہے بلکہ سنا ہے کہ خود خدا بھی ان کی مہیب تنہائی کا احترام کرتے ہوئے

انھیں ہمیشہ کے لیے تنہا چھوڑ دے گا۔ تاہم، بحیثیت انسان، ہمیں پیدائشی طور پر یہ یقین حاصل ہے کہ ہم سچے عمل کے قابل ہیں اور معروضی طور پر برحق ہونے کا امکان موجود ہے۔ دراصل ہمارے اندر المطلق کا شعور موجود ہے۔ اس استعداد کا انکار کردیں تو یہ انکار ہمیں ڈگمگا دیتا ہے، جڑ سے اکھاڑ ڈالتا ہے اور یہ خطرہ پیدا ہوجاتا ہے کہ ہم بے وزن تخیلات کی ایک مہمل دنیا میں تن تنہا محبوس ہوجائیں گے۔ ان سے نپٹنا ہمارے بس سے باہر ہے۔ حقیقت میں جن چیزوں کی ہستی ہی نہ ہو ان سے نپٹنا معلوم!

اس طرزِ فکر، اپنے گرد تعمیر کیے ہوئے ماحول اور زندہ رہنے کے لیے ہمیں جو کام کرنا پڑتا ہے اس کی بنا پر ہم بے دست و پا ہوکر غلامی کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ جہاں باز و سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے۔ ہمارا شکاری بھی کہیں قریب ہی گھات میں نہ ہو۔ ذرا دیکھ لیجیے!

باب سوم

خمیازۂ زر

مسلمانوں کے ہاں ایک حکایت ہے کہ ایک بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پہاڑوں سے گذر ہوا۔ وہاں انھیں ایک بوڑھا نظر آیا کہ پہاڑ پر کسی چھت یا چار دیواری کے بغیر موسموں کے سرد و گرم کے جلو میں دن کاٹتا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اُس سے پوچھا تو نے اپنے لیے گھر کیوں نہ بنالیا؟ بوڑھے نے جواب دیا ''اے روح اللہ، آپ سے پہلے آنے والے پیغمبروں نے بتا دیا تھا کہ میں صرف سات سو سال زندہ رہوں گا۔ اتنی سی مدت میں اپنی جان کیوں کھپاؤں۔

جن لوگوں کو اس سے بھی کم عرصہ جینے کی توقع ہو انھیں تو یہاں گھر بنانے سے پہلے یقیناً سوچنا چاہیے۔ حکمت پر مبنی جو عقائد ہمیں ورثے میں ملے ہیں ان میں یہی یقین دھانی کرائی گئی ہے کہ دنیا کو ایک گزرگاہ کے طور پر برتنا چاہیے، پڑاؤ کے طور پر نہیں۔ ارشاد نبوی ﷺ ہے ''میں ایک سوار کی طرح ہوں جو پل دو پل درخت کے نیچے سستا کر پھر اپنے راستے پر چل دے۔'' ان معنوں میں مسافر یا مردِ آزاد اور ایک آوارہ گرد میں کوئی مماثلت نہیں جس کی کوئی جڑ ہی نہ ہو۔ وہ لوگ جنھیں ابھی کسی اساس سماوی پر پختگی نصیب نہ ہوئی ہو ان کے قدم کم از کم زمین پر تو مضبوطی سے جمے رہنے چاہئیں کہ آخر ہم اپنی فطرت ارضی کے واسطے سے زمین کی کوکھ سے وابستہ ہیں۔ ایک مشتِ خاک۔ اس کے معدنیات ہماری رگوں میں دوڑ رہی ہیں اور اس کی طبعی قوتیں ہمارے اندر بھی اسی طرح مصروفِ عمل ہیں جس طرح ہمارے بدن کی جلد سے باہر کی دنیا میں۔

انسان تبھی استوار رہتا ہے اگر اس کی جڑیں ایک جگہ پیوست ہوں (اس بات کی معنوی گہرائی میں جایئے یا صرف لفظی مطلب لیجیے، دونوں معانی قابل غور ہیں)۔ اس کا مخصوص ٹھکانہ، مقام، اس کی جائیداد اس کا گھر سب اس کو جڑ پکڑنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ اشیا گویا اس کے جسم کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کے بغیر وہ اتنا ہی بے سہارا ہوتا ہے جتنا کچھوا اپنے خول کے بغیر۔ ایک پکی ہوئی، پوپلی پلپلی مخلوق جو شکاری کے لیے تر نوالہ ثابت ہوتی ہے۔ اس بات پر یقین نہ رکھنے کا مطلب یہ

ہے کہ انسان اس کھوکھلی مثالیت سے دھوکہ کھا جائے جو اسے تشدد آمیز انقلاب کے ذریعے اکھاڑ کر آزاد کرنے کی تبلیغ کرتی ہے۔ حالانکہ انسان کو آزاد کرنے کا اصل طریقہ ایسی تبدیلی ہے جو انسان اور اس کے مرکز دونوں کا حاطہ کر سکے۔ جب ہم تمام لوگوں کے لیے وسیع تر اور زیادہ بھرپور زندگی فراہم کرنے کے نام پر فرد کو اس کے نجی اور محدود میدان عمل سے محروم کر دیں جس میں وہ اپنی قوتِ انتخاب استعمال کر سکتا ہے اور اپنی ذمہ داریاں سمجھ سکتا ہے تو ہم ایک خود مختار ہستی کو نہیں بلکہ ایک برہنہ مخلوق کو جنم دیتے ہیں۔ ایسے مصلحین موجود ہیں جو دانا ڈاکٹروں کی طرح ہمیں صحت مند رکھنے کے لیے محنت کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ تغیر کا ایک ایسا ہوکا بھی پایا جاتا ہے جو ہماری حقیقی املاک کو ان آدرشوں کے لیے قربان کرنے پر فوراً تیار ہو جاتا ہے جن کو عملی جامہ پہنانا انسانی سطح پر ممکن ہے نہ سچ مچ کے مردوں اور عورتوں کی اصل ضروریات سے ان آدرشوں کا کوئی تعلق ہے۔

فرانسیسی قاموس نگاروں کے زمانے سے لے کر آج تک ہماری روز مرہ زندگی ان نظریہ بازوں کے رحم و کرم پر ہے جو اپنی پرسکون مطالعہ گاہ یا یونی ورسٹی لائبریریوں میں بیٹھ کر مجرد خیر اور مجرد سچ جیسے افکارِ عالیہ کے نشے میں چور، اپنے تخیلات اور خیالات کو کھلی چھٹی دیتے رہے ہیں۔ ان کو یقین تھا کہ انسانوں اور اشیا کی دور دراز دنیا کو ان کے خوابوں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔ ان کی ظاہری شکل و صورت اور ان کے پیش کردہ کلیوں پر نہ جایئے جن میں بظاہر گنجلک انسانی مسائل کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی خشک مزاجی کی تہ میں ایک عجیب طرح کا رقیق جذبہ کارفرما ہے جس کی تسکین کے لیے انسانوں سے کسی ربط و تعلق کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگ اکثر جیتے جی تو گمنام رہتے ہیں لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب ان کے مخفی جذبہ کی کوئی چنگاری خس و خاشاک پر جا پڑتی ہے، نوجوان ذہن سلگنے لگتے ہیں، بھٹکے ہوئے لوگوں کو ایک سمت نظر آ جاتی ہے اور عوام الناس حرکت میں آ جاتے ہیں۔ سوال کرنے والے ذہن کو تسکین پہنچانے والے جوابات کے اصل ماخذ سے ہمارا رابطہ کٹ چکا ہو تو پھر ہر وہ نظریہ جو بظاہر سوالات کے جواب اور عمل کے لیے بنیاد فراہم کرتا معلوم دے، صحرا میں ٹھنڈے پانی کی طرح لگتا ہے اور کوئی ایسی کسوٹی باقی نہیں رہتی جس کے ذریعے اسے معروضی طور پر پرکھا جا سکے۔

جب ان ''عظیم نظریات'' کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو ان کا تصادم انسانوں سے ہوتا ہے۔ عالمگیر عدل کے خواب گوشت پوست کے انسانوں سے ٹکراتے ہیں اور وہی لوگ جو

نظریہ باز کے ذہن میں ایک بے ضرر تجرید کی حیثیت رکھتے تھے، ترقی کے عمل میں رکاوٹ ثابت ہونے لگتے ہیں۔ بہت جلد سڑکوں پر سچ مچ کی لاشیں بکھر جاتی ہیں اور گلی کوچوں میں جیتا جاگتا خون بہتا نظر آنے لگتا ہے۔

مگر ضروری نہیں کہ تبدیلی ہمیشہ یک لخت ہو۔ رکاوٹیں دور کرنے اور انسانوں کو قابو میں لانے کے زیادہ عیارانہ اور نرم خو طریقے بھی ہیں۔ اگر ذرا تحمل سے کام لے کر کسی شخص کو خودکشی کرنے پر آمادہ کیا جاسکے تو اسے قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قدیم انسان خیر کے جس تصور سے وابستہ تھے اسے انسان کی سہولت یا مرضی کے مطابق موڑا نہیں جاسکتا تھا۔ جدید انسان کی اخلاقی حس اس تصور سے کٹ کر بگٹٹ ہو چکی ہے۔ ایسی صورت حال میں مستقل ترغیب کے ذریعے اگر اس اخلاقی حس کو ابھارا جائے تو یہ نہایت مؤثر چال ثابت ہوسکتی ہے۔ ایک نہ ایک دن نجی املاک تبدیلی اور تغیر کی سمت متعین کرنے والی قوتوں کے راستے میں رکاوٹ سمجھی جانے لگتی ہے۔ جس انسان کے پاس کوئی گوشہ ایسا نہ ہو جسے وہ اپنا کہہ سکے، اسے راستے سے ہٹانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ املاک جگہ گھیرتی ہیں اور نقل و حرکت کو محدود کرتی ہے۔ جس طرح نقشے کی سطح پر پہاڑی ٹیلے جن کی وجہ سے لکیر سیدھی نہیں کھینچی جاسکتی، یا کسی عظیم الشان منصوبے کے راستے میں آنے والے چھوٹے چھوٹے مکان۔

صنعتی ترقی کے ابتدائی دور میں ریلوے سب سے قابل فخر ایجاد تھی جسے میدانوں، پہاڑوں اور صحراؤں میں سے ایک سیدھی لکیر کی صورت میں گزرنا تھا۔ کچھ تو علاقے کے طبعی جغرافیائی نقوش کی بنا پر پیدا ہونے والی تکنیکی مجبوریوں کے باعث اور کچھ ان جاگیرداروں کی مخالفت کے سبب جو اس علاقے میں مضبوطی سے قدم جما چکے تھے، شروع میں یہ ممکن نہ تھا لیکن معاصر دنیا میں سیدھی لکیروں پر اصرار کیا جاتا ہے چاہے وہ سماجی، معاشی یا سیاسی کسی سطح پر ہوں۔ ٹیکنالوجی قدرتی رکاوٹوں کو دور کرنے میں مدد دیتی ہے اور نظریہ حیات کے سہارے انسان کی پیدا کردہ مزاحمتوں کو ہموار کرنے کا کام سرانجام دیا جاتا ہے۔

ریلوے تو بعد میں آنے والی تبدیلیوں کی ابتدائی صورت تھی۔ حکومت کی جدید تکنیک اور صنعتی تکنیک (جو اول الذکر روز بروز زیادہ اثر انداز ہونے لگی ہے) فوراً اصل مقصد کا رخ کرتے ہیں۔ اگر وہ انفرادی سنک یا نفع و نقصان یا جمی جمائی صورت حال کی حفاظت کی خاطر اپنا راستہ تبدیل کرنے لگیں تو ان کے لیے کام کرنا ناممکن ہو جائے۔ اس کے باوجود انسان کو اس کے انفرادی

شوق، مخصوص دلچسپیوں اور ایک خاص معاشرتی ماحول میں جماؤ سے محروم کر دیا جائے تو وہ اپنی بنیاد سے کٹ جاتے ہیں، اس کے بعد انھیں فائلوں میں بھرتی کرنا، ان کی عمومی افادیت اور عمومی دلچسپی کا شماریاتی تخمینہ لگانا ممکن ہو جاتا ہے۔

معاشی میدان میں جو بذات خود انسان کی حیثیت ارضی کی ایک تجرید ہے، یہ بیخ کنی اس طرح کی جاتی ہے کہ نجی ملکیت کی جگہ اجتماعی دولت لے لیتی ہے۔ حالانکہ یہ دونوں بالکل مختلف نوعیت کی حامل نہیں۔ اس امر کی طرف حنا آرنٹ نے اپنے سیر حاصل مقالے میں توجہ دلائی ہے۔[1] حالیہ زمانے میں بالقوہ یا فی الواقع جو بے تحاشا دولت مند معاشرے ابھر رہے ہیں وہ دولت مند ہونے کے باوجود بنیادی طور پر ملکیت سے محروم ہیں کیونکہ کسی فرد واحد کی دولت، معاشرے کی بحیثیت مجموعی سالانہ آمدنی میں اس کے حصے پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ دونوں چیزوں کا آپس میں کتنا تعلق ہے۔ دور جدید کا آغاز غریب کو بے دخل کرنے سے ہوا۔ پھر نئے محرومِ ملکیت طبقوں کو حقوق دیے گئے۔ اس سے قبل آنے والی تمام تہذیبوں میں نجی املاک کو مقدس جانا گیا۔ اس کے برخلاف دولت چاہے وہ نجی ہو یا اجتماعی آج سے قبل کبھی مقدس نہیں رہی۔ دراصل ابتدا میں جاگیر یا ملکیت سے مراد صرف یہ تھی کہ انسان کا دنیا کے کسی مخصوص متعین حصے میں ٹھکانا ہو۔

جائیداد (مس آرنٹ کے معنوں میں) صرف اکتساب شدہ دولت کی ایک خاص قسم ہی نہیں بلکہ ایک مانوس اور محفوظ خول ہے جو اپنے مالک سے اس طرح وابستہ ہوتا ہے کہ اسے علیحدہ کرنے کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ اسے فروخت کرنا خود کو بیچنے کے مترادف ہوگا اور ادائیگی محصول کے سلسلے میں جائیداد کی ضبطی اپاہج ہونے کے برابر ہے۔ اسی لیے تو ہمیشہ سے محصلین (Tax Gatherers) سے لوگوں کو چڑ رہی ہے۔ مکان، زمین کا ٹکڑا، یا کوئی اور پائیدار املاک جو نسل در نسل منتقل کی جا سکیں، کار یا ٹیلیویژن سے کیفیت کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں، جو بہت جلد بوسیدہ ہو جاتے ہیں۔

جب ذاتی ماحول میں ایسی پائیداری موجود ہو تو اس کے سہارے انسان اپنی مختصر اور متغیر زندگی کو ایک نسبتاً دیرپا پس منظر میں رکھ کر دیکھ سکتا ہے اور اس طرح عظیم تر اور اس دنیا سے ماورا مقاصد کے حصول کی بنیاد پڑ سکتی ہے۔ جس شخص کا بسترِ ولادت اور بسترِ مرگ ایک ہی ہو اس کی زندگی ایسے

۱- *The Human Condition*, Hannah Arendt University of Chicago Press, p.61.

سیاق میں گزرتی تھی جہاں وہ اپنی جڑیں مستحکم کرسکتا تھا اوران کے ذریعے توانائی حاصل کرسکتا تھا۔ وہ حرکت کرتا تھا، ہوسکتا ہے اس نے دور دراز کے سفر بھی کیے ہوں لیکن اس کا ماحول اپنی جگہ پر برقرار رہتا تھا۔حرکت انسان کی خاصیت ہونی چاہیے، ماحول کی نہیں۔

ان معنوں میں جائیداد نسل در نسل منتقل ہونے والی چیز ہے۔ جدید ذہن تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کی اندھی ضرورتوں سے مشروط ہو چکا ہے۔ اس لیے وہ وراثت کے تصور ہی سے گھبراتا ہے۔ اس بات پر صرف اشتراکی ہی نہیں جدیدیت کے تمام علمبردار اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہر شخص کو اپنی زندگی بلاکسی موروثی سہولت یا فوقیت کے شروع کرنی چاہیے اور خود اپنے لیے راستہ نکالنا چاہیے، اپنی دولت (سرمایہ داری کے معنوں میں) یا اپنا مرتبہ (اشتراکی اصطلاح میں) اپنی کاوشوں کے ذریعے حاصل کرنا چاہیے۔ یہ بڑے مزے کی بات ہوتی اگر انسان کی معاشرتی زندگی ایک سکول کے کھیلوں کے دن کی طرح ہوا کرتی لیکن ہماری دوڑ تو ایک ایسے بیابان میں ہورہی ہے جہاں صرف جنگلی درندے ہی نہیں ان سے زیادہ خطرناک مخلوق بھی موجود ہے۔ اگر سب افراد کو مسلح نہیں کیا جاسکتا تو کم از کم چند ایک کو تو حفاظتی ہتھیار رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جو لوگ مسلح ہیں وہ نہتے افراد کی حفاظت کرنے پر آمادہ ہوجائیں۔ اگر دس لوگوں کے گروہ کو ایک دشمن کا سامنا ہو اور صرف ایک کے پاس ہتھیار ہو تو کیا اس سے یہ مطالبہ کرنا جائز ہوگا کہ وہ مساوات اور انصاف کے نام پر یہ بندوق پھینک دے؟ جو لوگ خوش قسمتی سے ایک فلاحی مملکت کے زیر سایہ زندگی بسر کررہے ہوں اور خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑنے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے ہوں انھیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے کہ یہ آرام دہ صورت حال ہمیشہ برقرار رہے گی۔ ایسی خوش فہمیاں تو صرف وہی لوگ پال سکتے ہیں جو دنیا اور تاریخی حقائق سے بے خبر ہوں۔ مس آرنٹ نے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دور جدید کا آغاز معمولی آدمی کو بے دخل کرنے یا دوسرے الفاظ میں ایسے پرولتاری معاشرے کی تشکیل سے ہوا جو مشینی تہذیب کے تقاضوں پر پورا اُتر سکے۔

جب مارکس نے مزدوروں کو یقین دلایا تھا کہ اشتراکیت میں ان کا سوائے اس کے اور کوئی نقصان نہیں ہوگا کہ ان کی زنجیریں یا طوق چھن جائیں گے تو اس کی بات بے وزن نہیں تھی۔ ان کے پاس اور تھا ہی کیا جو چھن جاتا؟ لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ ایسے محروم از ملکیت طریقے کا وجود یورپ یا کسی اور مقام پر ہمیشہ سے رہا ہے۔ ان کی نظیر اگر تاریخ میں کہیں ملتی ہے تو زرخرید غلاموں

کی صورت میں۔ محروم ملکیت لوگ کسی بھی معاشرے کے لیے بہت بڑا خطرہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔ کسی بھی شخص سے اس کا تھوڑا بہت ذاتی سرمایہ، اس کا ٹھکانہ چھین لو اور اسے غلام بناڈالو بالکل اسی طرح جیسے صنعتی نظام نے انسان کو غلام بنا رکھا ہے۔ پھر اس کی حالت پر توجہ دو، اس کا مرتبہ بلند کر کے اس کی اپنی محنت سے پیدا کردہ دولت میں سے مناسب حصہ اس کے حوالے کر دو۔ اب وہ یقیناً پہلے سے زیادہ آسودہ ہے لیکن وہ بھول چکا ہے کہ ملکیت کا احساس کیا ہوتا ہے؟ وہ سماجی بہاؤ میں اس قدر رچ بس جاتا ہے کہ کبھی اس کا راستہ نہیں روکتا چاہے سماج کا رخ غلط طرف ہی کیوں نہ ہو۔

غصب کرنے کا عمل سماجی مراتب کے بلند ترین درجے سے بھی شروع ہوسکتا ہے۔ پہلے بڑے آدمی کو نشانہ بنایا جائے۔ عام آدمی جو اسے رشک کی نظر سے دیکھتا ہے اس کو زیر ہوتا دیکھ کر بغلیں بجائے گا۔ ایک دفعہ بڑا آدمی بے بس ہوجائے تو چھوٹے آدمی کو راستے سے ہٹانا بہت آسان ہوجائے گا۔ ملکیت اور وراثت کے معاملے میں اگر ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیا تو سب باری باری نشانہ بن جائیں گے۔ ہنگامی حالات میں اگر ایک دفعہ بڑے آدمی کی حویلی دشمن کے لشکر کے قبضے میں چلی جائے تو چھوٹے آدمی کے جھونپڑے کی حفاظت ناممکن ہوجاتی ہے۔ پرانے وقتوں میں یہ حویلی صرف مقامی رئیس کا گھر ہی نہیں بلکہ ہنگامی اور خانہ جنگی کے حالات میں آس پاس کے دیہاتوں کے لیے پناہ گاہ بھی ہوتی تھی۔

ملکیت سے بے دخل شدہ لوگوں اور ملکیت سے بے نیاز رہنے والوں کے درمیان جو فرق ہے اس پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے کیونکہ یہ دونوں متضاد ہونے کے باوجود ظاہری سطح پر متشابہت رکھتے ہیں جس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ صوفیا یا اولیا اللہ بنیادی طور پر اس دنیا سے تہی دست ہوتے ہیں لیکن وہ ایسی ہستیاں ہیں جنھیں ارضی بنیادوں سے قوت اور توانائی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں، اس کے لیے انھیں ایک اور سرچشمہ میسر ہے۔ عام آدمی کا روحانی جوہر ذات کی گہرائیوں میں نہاں ہوتا ہے۔ آدمی کی ارضی وابستگیوں کو قطع کر دینے کا بے رحم طریق کار اس جوہر کو سطح تک کھینچ لانے میں بالکل غیر مؤثر ثابت ہوتا ہے۔ انسان کو اس کا ذاتی قطعۂ زمین درکار ہے اور یہ بات متناقض سہی لیکن حقیقت ہے کہ اگر وقت سے پہلے انسان کو اس سہارے سے محروم کر دیا جائے تو وہ اس کی سطح سے بلند نہیں ہوسکتا۔ لاروا کبھی تتلی میں تبدیل نہیں ہوسکتی اگر اسے قبل از وقت اپنے خول سے محروم کر دیا جائے۔

ہمارے نظریہ بازوں کی سفاک اور غیر حقیقی مثالیت اس امر کو قطعاً نظر انداز کر دیتی ہے اور وہ نفوس انسانی کو ہر قسم کے جوکھم میں ڈالنے کو تیار رہتے ہیں۔ نفسیات اور ''نفسیات بازی'' کے اس دور میں انسانی فطرت اور انسانی ضروریات کے بارے میں حیران کن جہالت سے واسطہ پڑتا ہے۔ عیسائیت کے خاتمے اور دور جدید کے آغاز کے نتیجے میں جس اخلاقیات نے رواج پایا، یہ نظریہ باز مصر ہیں کہ انسانوں کو اسی اخلاقیات کے قائم کردہ خانوں میں پورا اترنا چاہیے اور اگر وہ اپنی اصل صورت میں اس پر پورے نہ اتر سکیں تو انھیں یا تو اس سے مطابقت پیدا کرنی ہوگی یا پھر فنا ہونا پڑے گا۔ اس اصول کے تحت یہ جائز ہوگا کہ چند بچوں کو جو تیرنا نہیں جانتے گہرے پانی میں دھکیل دیا جائے، ان میں سے دو چار تو تیر جائیں گے، باقی بلاشبہ ڈوب جائیں گے۔

بے ملکیت رہنا یا تو صوفی کو زیب دیتا ہے یا قزاق کو، بے خانماں رہنا یا تو جہاں گشت درویش اور سادھو کے لیے مناسب ہے یا آوارہ گرد کے لیے۔ لوگوں کی اکثریت کو اپنے گرد و پیش کی اشیا کے ثبات پر بھروسہ درکار ہوتا ہے ورنہ وقت کے بہاؤ میں ایک طرح کی داخلی تحلیل سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے اور آج ہمیں اس کی ہمیشہ سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ ہم ایک مشینی تہذیب میں جی رہے ہیں اور مشینیں اپنی حرکت کی باقاعدگی میں گھڑیوں کی طرح ہیں جو انسانی ذہن اور انسانی جسم پر مشینی وقت کے قوانین عاید کرتے ہیں۔

اگر ہمیں اپنے ماحول میں محض متحرک اجسام کی طرح نہیں بلکہ مکمل انسانوں کی طرح پلنا بڑھنا ہے تو ہمیں اس سے استحکام اور بھروسے کے علاوہ اور بھی کچھ چاہیے۔ ہمارے لیے اپنے ماحول میں معانی کی دریافت ضروری ہے، ایسے معانی جو آسانی سے سلب نہ ہو سکیں اور جن پر طنابیں استوار کی جا سکیں۔ بناوٹی گھڑے گھڑائے ماحول میں یہ معنی عنقا ہوتے ہیں تا آنکہ اس ساخت کی بنیاد وجدانی حسن کے ایسے فن پاروں پر ہو جن پر عشق و دانش کے ساتھ ساتھ مہارت اور محنت بھی لٹائی گئی ہو۔ مستقل طور پر اپنی مشقت اور اپنے ذہن کی پیداوار کے درمیان رہنا انسانوں کے لیے مضر ہے کیونکہ دراصل یہ ایک بناوٹی اور بالواسطہ ماحول ہے اور انھیں اس حد تک متوجہ نہیں کر سکتا کہ ان کو اجتماعی یا ذاتی تخیلات میں گم ہونے سے باز رکھ سکے۔ حقیقت سے ان کا تعلق خفیف سا رہ جاتا ہے جبکہ اس تعلق کے بغیر کوئی بھی مخلوق، جسمانی یا روحانی دونوں طرح زندہ نہیں رہ سکتی۔

اس قسم کا ماحول سٹیج سیٹ سے مناسبت رکھتا ہے اور اس پر انتہائی محال اور غیر متعلق ناٹک رچائے جاتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جب صرف باطل ہی ممکن نظر آنے لگتا ہے اور حق اتنا

بے تکا معلوم ہوتا ہے جیسے کھلونے کے بھالوؤں میں کوئی سچ مچ کا ریچھ آ گھسے۔ ہمارے شہر اس طرح کے ناٹک گھر ہیں۔ انھیں تعمیر نہیں تدبیر کیا جاتا ہے اور یہ اپنی ٹھوس پختگی کے باوجود (یا شاید اس پختگی کی وجہ سے) انہدام اور تعمیر نو کے مراحل سے گزر کر شکل بدلتے رہتے ہیں۔ ان میں سوائے ہندسی تناسب کے اور کوئی کشش نہیں اور اسی وجہ سے ان کے مصنوعی پن میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فطرت میں بھی سوائے بلور کے مکمل تناسب کہیں نہیں پایا جاتا۔ علم ہندسہ کے قوانین زندہ اجسام پر لاگو ہونے والے قوانین سے یکسر مختلف ہیں اور اگر انسانی ماحول پر زبردستی ان کا اطلاق کیا جائے تو پروکرستس[1] کا بستر تیار ہو جاتا ہے جس میں آرام یا فرحت نصیب نہیں ہو سکتی۔ مزید برآں ہندسی ماحول طبعاً ایک قسم کی کمیتی کاملیت کا دعویٰ کرتا ہے جس میں ہر زاویہ، ہر پیمائش ریاضی کے اعتبار سے جچی تلی ہوتی ہے۔ یہ کاملیت ہمارے ارضی سیاق سے جس میں کوئی شے بھی حتمی، مکمل یا کامل نہیں ہے میل نہیں کھاتی۔ یہ تو اس جھوٹی کمال پرستی اور مثالیت پرستی کا شاخسانہ ہے جسے آجکل بڑی مستعدی سے انسانی معاشروں کی تشکیل میں استعمال کیا جا رہا ہے اور جو انسانوں کو تناسبی نمونوں کے مطابق ڈھالنے پر مصر ہے۔

یہ شہر ان کارکنوں کی کھولیاں بننے کے لائق ہیں جن کے استحصالی نظام مشین کے تقاضوں کے مطابق ڈھالے جاتے ہیں۔ جو شخص فطری ماحول میں رہتا ہے اس کے پاس ماورائے فطرت تک رسائی حاصل کرنے کا موقع موجود ہے لیکن مصنوعی ماحول میں رہنے والا شخص اگر اپنی آدمیت ہی برقرار رکھ پائے تو بہت غنیمت ہوگا۔ صرف اتنا کرنے کے لیے بھی جدید طرز کی فیکٹری میں کام کرنے والے ایک کارکن کو اسقدر دم خم اور شہ زوری کی ضرورت پڑتی ہے کہ اگر کسی صحیح مقام پر استعمال کی جائے تو انسان ولایت کے درجے تک پہنچ سکتا ہے۔

فرتھجوف شواں کا کہنا ہے کہ ایک مشینی دنیا میں روحانی صداقتوں کا گزر نہیں ہو سکتا۔ ''یہ دنیا مشینوں اور دھات سے بنی ہے۔ شور و غوغا، خفیہ اور فریبی طاقتیں، کابوسی ماحول، ناقابل تفہیم واقعات۔ مختصراً یہ کہ بدصورتی اور بے مائیگی کے درمیان گزرنے والی ایک حشرات الارضی ایسی زندگی..... جب صنعتی کارکن یہ کہتا ہے کہ اس کے پاس نماز کے لیے وقت نہیں ہے تو کچھ غلط نہیں کہتا۔

1- *Procrustean*

وہ تو اپنی حالت کے غیر انسانی بلکہ تحت الانسانی ہونے کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔[۱] اس اثنا میں تمام تر شور وغل کے بیچ بھی اگر اس میں جاننے اور سمجھنے کے شوق کی کوئی چنگاری بچ رہتی ہے تو اسے ایسے سچ کی جگہ جو پورے آدمی کو مطمئن کر سکے، کھوکھلی تجریدوں اور الحاد کے پتلے شوربے کا راتب پیش کیا جاتا ہے۔

تجرید اور ناقابل فہم واقعات پر مبنی ماحول اس قابل نہیں ہوتا کہ انسان کی روزمرہ زندگی میں معانی کی تلاش کی ضرورت کو پورا کر سکے۔ اس ضرورت کو محتاج تسکین رکھنا نازی کیمپوں میں حوصلہ پست کرنے کا سب سے مؤثر طریق کار تھا۔ بے معنی اور مہمل فرائض کار، وحشت انگیز بدصورت ماحول، ایسے مظالم جو نتیجہ وسبب کے معلوم قوانین سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے۔ ان حربوں کے ذریعے عقوبت اور ذلت کی ایک مہمل اور بے معنی دنیا تخلیق کر دی گئی۔ وہاں اذیت اور سزا بلا تخصیص دی جاتی تھی۔ سزا کا جرم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ کسی مشقتی گروہ میں بغاوت کے آثار نظر آنے پر اس گروہ کے سب سے مسکین رکن کو گولی سے اڑانے کے اتنے ہی امکانات تھے جتنے شر پسند رکن کو۔ اگر کوڑے مارنے کے احکام جاری ہوئے ہیں تو بلا امتیاز کسی کو بھی کوڑے لگائے جا سکتے ہیں۔ انسان ایسی اکائیاں بن گئے تھے جنھیں ادل بدل کیا جا سکتا تھا۔ سزا کی اصطلاح ہی بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ گویا ایک بے شکل بے چہرہ بنی نوع انسان خود کو سزا دے رہی ہو۔

کیمپ کے کھاتوں کی اغلاط کو کاغذ کی بجائے انسانوں پر درست کیا جا سکتا تھا۔[۲] قیدی عورتوں مردوں یا بچوں کی تعداد اگر کھاتے کے اندراج کے مطابق نہ ہوتی تو کمی کو پورا کرنے کے لیے مزید لوگ گرفتار کر لیے جاتے اور زیادتی کو گھٹانے کے لیے ایک کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ اس میں کسی ذاتی رنجش کا دخل نہیں تھا۔ انتظامی کل پرزے اس سادہ قانون کے تحت کام کرتے تھے جو اس قسم کے عمل پر لاگو ہوتا ہے۔ پھر بھی اس سب کے پیچھے جو محرکات ہیں ان کی شخصی بنیاد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے یہ نظام اختراع کیا تھا وہ انسانی سطح سے گر کر عمل طبعی کے ان نچلے درجوں تک پہنچ چکے تھے جہاں عقل کی روشنی سرایت نہیں کر پاتی۔ ہمارا عہد فطرت کے ''اندھے رخ'' سے تکلیف دہ حد تک آگاہ ہے۔ نباتات کی اندھا دھند بڑھوتری، دریا کی تہ میں منتظر گربہ مچھلیاں جو کثافت پر پلتی ہیں، مصروف اور سرگرم چیونٹیاں ــــ مختصراً یہ کہ خوراک کھانے اور

۱- *Language of the Self*, Frithjof Schuon, pp.153-4.

۲- Bettelheim, *op. cit*, p. 245.

خوراک بننے کی تمام تر سرگرمی ــــ بحیثیت عالم اصغر انسان تمام موجودات اور امکانات کا حامل ہے۔ چنانچہ عمل فطری کا تاریک رخ کبھی کبھار اس پر غالب آ جاتا ہے۔ جن لوگوں پر یہ غالب آ چکا ہو وہ نتیجتاً انتہائی یاس اور شکستگی کے عالم میں دوسروں کو اپنی جیسی حالت پر پہنچا کر اور خود دار شخص کو اپنی سطح پر لا کر ایک طرح کی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ جیتے جی جہنم میں پہنچنے اور اس روشنی سے محرومی کے بعد جسے انھوں نے خود ترک کیا ہے وہ یہ ضمانت حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ باقی دنیا بھی اس جہنم میں تبدیل ہو جائے۔

جو لوگ اس پر تلے بیٹھے ہیں کہ اگر مٹا سکیں تو خدا کے نقش کو مٹا ڈالیں، انھیں انسانی صورت میں یہ نقش بآسانی اپنا اور اپنے آلات کا نشانہ بنتا نظر آتا ہے۔ اگر شکار پہلے ہی سے ملکیت سے بے دخل کیا جا چکا ہو اور ہجوم کی ایک اکائی اور ایک معمولی آدمی بن چکا ہو تو ان لوگوں کا کام مزید آسان ہو جاتا ہے۔

ارضی قالب کے اندر اپنے فانی ہونے کے احساس کو مٹانے اور فطری عمل کی روانی میں ثابت جزیرے تعمیر کرنے کی کوشش میں انسانوں نے خود سے زیادہ دیرپا اشیا تخلیق کی ہیں اور یہ تخلیقی کاوشیں محض بیکار کی بیگار نہیں تھی بلکہ ان کا مقصد عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ ایسی چیزیں تخلیق کی جائیں جن میں نور ازلی کی کوئی کرن منعکس ہو سکے، چاہے خام انداز میں سہی اور مسلسل تغیر کے درمیان ایک مقام ثبات کی یاد دلائی جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اقوام کی املاک میں ہمیشہ ایک تقدس کا رنگ پایا جاتا ہے کیونکہ ان کی تعمیر ایسی عبادات کی ہمراہی میں ہوئی تھی جو ان کا تعلق اپنے اعیان ثابتہ سے جوڑتی ہیں۔ اس طرح انسان کی محنت اور آرام دونوں ہی نہ صرف فطری عمل سے بندھے ہوئے تھے بلکہ ایسی تخلیقات کے درمیان عمل میں آتے تھے جنھیں ''عرش پاروں'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ پارے یا ذرے کتنے ہی شکستہ اور بکھرے ہوئے کیوں نہ ہوں، بہرحال باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتے رہتے، تسلسل کو برقرار رکھتے اور جن کے ہاتھوں میں جاتے انھیں یہ یاد دلاتے رہتے کہ آدمی نہ تو وقت کے دھارے میں مکمل طور پر غرق ہے اور نہ ہی اس کے توڑ پھوڑ کے عمل کا پوری طرح پابند۔ خارجی چیزوں اور اپنی مختصر زندگیوں کے ساز و سامان میں اس امر کو آشکار دیکھنے کے بعد وہ اپنے اندر ان عناصر کا جلد ادراک کر سکتے ہیں جو وقت کے سیل رواں سے ارفع ہیں اور ان کے قلوب میں ثبت نقش ابدیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ وہ آسمانی سلطنت ہے جس کے متعلق

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ ''آسمانی بادشاہت تمہارے اندر ہے۔'' جو لوگ یہ ادراک کرلیں وہ نظریے اور فیشن کے متلون دھارے میں آسانی سے نہیں بہتے۔

صنعتی تہذیب کی مصنوعات تو ہم انسانوں سے بھی زیادہ بے ثبات ہیں۔ ہم سے پہلے ہماری چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے گھروں کا سامان ایک دہائی کے اندر اندر پرانے فیشن کا کہلانے لگتا ہے (اگر تب تک سلامت رہ جائے تو) اور وہ وقت بھی دور نہیں جب ہمارے مکان ہم سے زیادہ ناپائیدار ہو جائیں گے۔ یہ چیزیں اب وقت کے دھارے میں کوئی لنگر فراہم نہیں کرتیں بلکہ اپنے ساتھ ہمیں بھی اس تیز دھارے میں بہالے جاتی ہیں۔ ہماری بنائی ہوئی چیزوں کی عارضی نوعیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ ہم اپنے ذہن میں اس دنیا کی کوئی تصویر نہیں بنا سکتے جس میں ہمارے پوتے تو خیر دور کی بات ہیں، ہمارے بیٹے رہیں گے۔ ایک طرف تو ہم ایٹمی تباہی کے امکانات سے مضطرب ہیں، دوسری طرف تکنیکی ترقی کے رفتار سے چکرائے ہوئے۔ ایسے میں بہت کم لوگ مستقبل کے ماحول کو تصور میں لانے کی ہمت کریں گے۔ اس میں البتہ کوئی شک نہیں کہ اس ماحول کی ہمارے آج کے سیاق سے کوئی مشابہت نہیں ہوگی اور چونکہ انسانوں کے کردار اور رویے ان کے ماحول سے وابستہ ہوتے ہیں، اس لیے ہمارا اپنے بعد آنے والوں سے رشتے کا بندھن بھی باقی نہ رہ سکے گا۔ اتنا ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہم سے مختلف ہوں گے اور ہمیں ان سے کرنے کو بات نہیں سوجھے گی۔

تاہم، ایک بات اکثر فراموش کردی جاتی ہے اور وہ یہ کہ ہنگامی تبدیلی ترقی نہیں انحطاط کا خاصہ ہے اور جس جسم کو بلوغت تک پہنچنے میں لگ بھگ اٹھارہ سال صرف ہوئے وہ بہت کم تر عرصے میں پگھل کر اپنے کیمیاوی اجزا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

اب جبکہ ہم خود کس حد تک فطرت سے آزاد اور انسان ساختہ تہذیبی ڈھانچوں کے بل پر فطری طاقتوں سے محفوظ سمجھنے لگے ہیں، تو لوگ ہمیشہ سے زیادہ ایسے سانچوں میں ڈھلتے نظر آتے ہیں جو انسانی رہن سہن کی بجائے طبیعی عمل کی یاد دلاتے ہیں اس لیے کہ اب لوگ تقریباً مکمل طور پر کمیتی اور تکراری کاموں میں مصروف رہنے لگے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آسٹریلیا کا پراچینی باشندہ جو برف میں نیزہ مار کر مچھلیاں تلاش کرتا پھرتا ہے، جدید فیکٹری کے مزدور کے مقابلے میں طبعی عمل سے نسبتاً آزاد اور ایک ممتاز تر انسان ہے اس لیے کہ وہ ایک بامقصد سفر پر نکلا ہے۔ فیکٹری مزدور ایسے

کسی سفر پر نہیں نکلتا کیونکہ اس کی محنت تو دراصل بے معنی افعال کی تکرار پیہم سے زیادہ اور کچھ نہیں اور وہ اپنے گھر سے اپنے مقامِ کار تک اس طرح متحرک رہتا ہے جس طرح کھڈی پر پھرکی گھومتی ہے۔

آج کی دنیا بے تحاشا پیداوار اور بے اندازہ کھپت کی دنیا ہے اور اس میں ہم نے اس اسراف کی نقل کرنا شروع کردی ہے جسے عام طور پر ''فطرت کی ارذل شکل'' کہا جاتا ہے یعنی فطرت کا وہ رخ جس تک عقل کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ جب تک انسان جزرس تھے وہ طبعی عمل سے یکسر الگ نظر آتے تھے اور جو کچھ وہ تغیر کے دھارے سے اپنے لیے اخذ کرتے تھے وہ نسبتاً پائیدار حالت میں ان کے اردگرد متشکل ہوجاتا تھا۔ اب چیزیں مشینوں سے اس رفتار سے ابلتی ہیں جس طرح مرطوب خطوں میں سبزہ اگتا ہے اور نمودار ہوتے ہی استعمال ہوکر ادواری عمل میں واپس جاملتی ہیں۔ انسان کے حیاتیاتی تفاعل میں بالکل اس قسم کی باقاعدگی اور تکرار پائی جاتی ہے لیکن بحیثیت انسان اپنے انوکھے راستے پر چلنا اس کی فطرت ہے یعنی حیاتیاتی زندگی کی یکسانیت کو روندتے ہوئے ایسے مقصود کی طرف بڑھنا جو اس یکساں عمل سے انتہائی ماورا ہے۔ اگر اسے ایسی اشیا کی تکراری پیداوار میں پھنسا دیا جائے جن کی کوئی لاینفک قدر و قیمت نہیں اور جو حقیقی ضرورتوں کی بجائے محض اشیائے صرف کی نہ بجھنے والی ہوس کو پورا کرنے کے لیے بنائی جاتی ہیں تو یہ انسان کو ایک عملِ رایگاں میں جھونک دینے کے مترادف ہوگا۔

مس حنا آرنٹ لکھتی ہیں[1] ''ہمیں اپنے گھروں، اپنے سامان، اپنی گاڑیوں کو استعمال کر ڈالنا ہے ایسے ہڑپ کرنے کے انداز میں گویا وہ فطرت کی عطا کردہ نعمتوں میں سے ہوں جو انسان کے استحصالی نظام اور فطرت کے درمیان ہر دم جاری دوڑ میں شامل نہ کی گئیں تو باسی ہوکر ضائع ہوجائیں گی۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم نے ان امتیازی سرحدوں کو مٹا ڈالا ہے جو انسان ساختہ دنیا کو فطرت سے محفوظ رکھتی ہیں ــــ نہ صرف فطرت سے بلکہ اس کے اندر ہر دم جاری حیاتیاتی عمل اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے طبعی ادواری سلسلوں سے بھی انسان کو الگ رکھتی تھیں۔ ان سرحدوں کے کھلتے ہی انسانی دنیا کا استحکام (جو پہلے ہی ہر دم خطرے میں رہتا ہے) اس عمل اور ان سلسلوں کے رحم و کرم پر رہ جاتا ہے۔

اس ضمن میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ فطرت ابہام کی ماں ہے ایک طرف تو یہ نور ماورا کو منعکس کرتی ہے اور ایسی علامتوں اور نشانیوں پر مشتمل ہے جو اس نور میں مندمج حقائق کا پتہ دیتی ہیں۔

1- Hannah Arendt, *op. cit*, p.126.

دوسری طرف اپنے غیر انعکاسی روپ میں یہ ایک تاریک بھنور کی طرح ہے جو انسان اور اشیا دونوں کو خاک میں تحلیل کر دیتی ہے۔

چنانچہ جس صناعی اور حرفت کا مس آرنٹ ذکر کر رہی ہیں، وہ عناصر فطرت کے تخریبی اور بے حس پہلو سے مختلف ہے اس لیے کہ اس میں عقلِ انسانی کی کارفرمائی اور عالم طبعی کو ایک ہیئت عطا کرنے کے عمل نے ایک شرف اور بلندی پیدا کر دی ہے۔ یہ امر بہت معنی خیز ہے کہ سماجی دولت، نجی ملکیت کے برعکس، تباہی اور تخریب کے ذریعے پروان چڑھتی ہے۔ دونوں عظیم عالمی جنگوں نے جہاں بہت سی ''متروک'' چیزوں کو صفحۂ یورپ سے معدوم کیا اور ٹیکنالوجی میں نئی روح پھونک دی وہاں چند سال کے اندر اندر سماجی دولت میں نمایاں اضافے کا باعث بھی بنیں۔ جبکہ استحکام اور ملکیت کا تحفظ مشینی معاشرے کے اس عمل کو سست کر دیتا ہے۔

اگر معیار حرکت برقرار رکھنا مقصود ہے (بلکہ ممکن ہے ہم اس مقام پر پہنچ چکے ہوں جہاں اگر اسے برقرار نہ رکھا گیا تو پورا ڈھانچہ ڈھے جائے گا) تو ہر شے کو اس مشینی عمل کا نوالہ بننا پڑیگا۔ بیٹل ہائم لکھتے ہیں کہ ''مشقتی کیمپ ہو یا موت گھر، ان میں ہونے والے مظالم اس تصور کے نامعقول حد تک اطلاق کی مثالیں ہیں جس کی رو سے محنت بھی ایک جنس ہے۔'' وہ مزید لکھتے ہیں ''کیمپوں میں صرف انسانی محنت ہی نہیں پورا آدمی ہی ایک فروختنی جنس بن کر رہ گیا تھا۔''[1] جس قسم کی دنیا میں ہم آج رہتے ہیں وہاں اس قسم کے تصورات کا اطلاق جلد ہی عقل کی حد پار کر جاتا ہے اور جب ایک دفعہ انسان جنس بن کر رہ جائے تو ذمہ داری (اگر باقی ہو تب) صرف غیر شخصی طاقتوں سے وابستہ رہ جاتی ہے۔ مثلاً تند و تیز ہوا جس کے جھکڑ اپنے سامنے آنے والی ہر شے کو زمین بوس کر دیتے ہیں اور ہوا کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔

دوسری طرف انسان چھوٹی چھوٹی اشیا کو گلے سے لگائے رکھتے ہیں۔ گویا وہ چیزوں کے ساتھ ساتھ اپنا بھی تحفظ کر رہے ہوں۔ وہ بوڑھا دھقان جو عمر بھر کی جمع پونجی اپنی کھاٹ تلے چھپا کر رکھتا ہے، کتنی پرسوز تصویر پیش کرتا ہے۔ وہ بنکوں پر اعتبار نہیں کرتا کیونکہ وہ ان کی پشت پر موجود طاقتوں کی بو سونگھ لیتا ہے جو اس سے سکون و ثبات کے بچے کھچے ریزے بھی چھین لینا چاہتی ہیں۔ اس نے اس سیلِ رواں یعنی اپنے ملک کی معیشت سے جو کچھ حاصل کیا ہے اسے واپس دریا برد نہیں کرنا چاہتا۔

1- Bettelheim, *op. cit*, p.243.

وہ معاشرے کا دشمن ہے کیونکہ یہ بات اس کی سمجھ سے باہر ہے کہ جو کچھ اس نے کمایا وہ درحقیقت ''اس کا'' اپنا نہیں تھا بلکہ اسے ''قوت خرید'' کے طور پر ادھار دیا گیا تھا۔ مزید برآں اسے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جو چھپے ہوئے نوٹ یا دھات کے سکے اس تک پہنچتے ہیں وہ ''قدر و قیمت'' (Value) رکھتے ہیں۔ انسان ہونے کی وجہ سے ایک نوع کا علم اور ایک خاص حسِ مراتب اسے میراث میں ملی ہے۔ (جس کا مکمل طور پر قلع قمع نہیں کیا جا سکتا) لہٰذا وہ قدر و قیمت اور استحکام کو لازم و ملزوم تصور کرتا ہے۔ اسے ایسی چیز سمجھتا ہے جو نشیب و فراز کے دوران میں انسان کو سہارا مہیا کر سکتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی کرنسی کی مالیت برقرار رہے گی۔ کسی نے اس پر یہ واضح نہیں کیا تھا کہ اس کرنسی کی وقعت ایک ٹکٹ سے زیادہ نہیں جس کے ذریعے اشیائے صرف تو خریدی جا سکتی ہیں، لیکن اگر اس نے انھیں سینت کر رکھنے کی کوشش کی تو اس کے پلے سونا نہیں صرف بے قیمت کاغذ رہ جائے گا۔ افراط زر کا عمل تمام ثابت جزیروں کو سیل رواں میں تحلیل کرنے اور مقامی مراعات کو تباہ کرنے میں بے حد موثر ثابت ہوتا ہے۔

انسانی دنیا مخصوص خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہے، اس لیے ایک سطح پر کرنسی کی قیمت گرنے سے دوسری سطح پر بھی یکساں عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ انسان اپنی جبلت میں اتحاد کی طرف مائل ہوتے ہیں خواہ نظریہ کتنی ہی تفریق پیدا کیا کرے۔ جو پیسہ کل تک کچھ نہ کچھ تحفظ فراہم کر سکتا تھا وہ اگر آج بے قیمت ہے تو آسانی سے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ ہر قابل قدر چیز مسلسل تغیر کے رحم و کرم پر ہے اور کل کا خیر آج کا شر بھی کہلا سکتا ہے۔ بے شک یہی وجہ تھی کہ پرانے وقتوں میں سکے ایک مقدس حیثیت کے حامل تھے اور سونا اپنی بھرپور علامتی اہمیت کے باعث کچھ عرصہ پہلے تک تمام بڑی کرنسیوں کو مربوط رکھنے کا کام دیتا تھا۔[1] کسی بھی شے کو اس کے مقدس یا علامتی پہلو سے محروم کر کے نرے کمیتی مظاہر کے بہاؤ میں دھکیل دیا جائے تو اس کی قدر اس طرح غائب ہو جاتی ہے جس طرح تیزاب میں ڈالنے سے ہڈیوں پر سے ماس اتر جاتا ہے۔

پیسے کی قیمت گرنے سے ایک طرف تو ہر قسم کے دیرپا اصولوں پر یقین کمزور پڑ جاتا ہے اور دوسری طرف اگر ایک دفعہ یہ عمل ایک خاص حد رفتار سے بڑھ جائے تو یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ

۱- ہماری عرفانی روایت میں سونا، مٹی کے باطن میں پوشیدہ اُس قدسی حالت اور اُس علوی امکان کا نام ہے جو اسے حقیقت کی کیمیا سے جوڑے رکھتا ہے۔ (مترجم)

کوئی شخص بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے یا تحفظ کی ذاتی بنیاد قائم کرنے کی کوشش نہیں کر پائے گا۔ ہر کسی کو اپنے تحفظ کے لیے ریاست سے رجوع کرنا پڑے گا۔ چنانچہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ جو لوگ بے ہیتی اور بے ہنگم پن کے طالب ہیں اور انسانی آزادی سے بہر صورت کد رکھتے ہیں، وہ افراطِ زر کے عمل کا بخوشی استقبال کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ عمل جمی ہوئی صورتوں کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے اور تمام مستحکم اور ٹھوس اشیا کو نگل جاتا ہے۔ ایک طرف بے ہیتی کی یہ طلب ہے دوسری طرف معانی سے پیچھا چھڑانے کی خواہش جو بڑی حد تک نازیوں کے بدترین مظالم کا محرک بنی۔ ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ان دونوں کی تہ میں ایک ہی گہری خواہش پنہاں ہے۔ ہمیں اس بات کا پورا اندازہ نہیں کہ یہ خواہش کس قدر عام ہے۔ یعنی انسانیت کا جوا اتار پھینکنے اور بحیثیت انسان جس ذمہ داری اور انتخاب کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اس سے کنی کترا کر بے نام اور بے امتیاز ہو جانے کی خواہش۔

اکثر بڑی برائیوں کی طرح یہ بھی ایک عظیم نیکی کا تاریک رخ ہے۔ تحت الارضی تاریکیوں میں کھو جانے اور ''انا'' کی آمریت سے ہمیشہ کے لیے نجات پانے کی تلخ آرزو، نور ربانی میں فنا ہو کر کامل ہو جانے کی متبرک تڑپ کی وحشیانہ نقل ہے۔ جو لوگ اپنے چھوٹے پن میں مطمئن ہیں وہ نہ تو اللہ والوں کو سمجھ سکتے ہیں نہ ہی گناہگار کو (یہاں ہم گناہگاری کی اصطلاح کو اس کے عمیق ترین معنوں میں استعمال کر رہے ہیں)۔ یہ امر بہر حال موجود رہے گا کہ مؤخر الذکر ہمیں تباہ کرنا چاہتا ہے اور اسے روکنا آسان نہیں۔

جو لوگ طبعاً منقسم المزاج فکر کے حامل ہیں انھیں تجربے کی مختلف سطحوں سے متعلق مظاہر کو باہم مربوط کرنے کا عمل عجیب اور الجھا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک ہی سانس میں افراط زر اور طاغوتی پستیوں کی مقناطیسیت کی بات کرنا ان کے نزدیک منطق کے بنیادی امتیازات کو رد کرنے کے برابر ہے۔ تاہم چونکہ چیزیں ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور آخر الامر ایک ہی منبع سے اخذ کی جاتی ہیں، فکر استدلالی انسانی معاملات کے اس تانے بانے کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ کسی ایک ساز کے بس ایک تار کو چھیڑ دیجیے، ایسے طبقات میں جو ہماری حد ادراک سے باہر ہیں بے شمار تار جھنجھنا اٹھیں گے۔

بہر حال آجکل جزویت کا دور ہے جو عقل کی فعالیت سے لے کر جسمانی مشقت کے شعبے تک پھیلی ہوئی ہے، گویا تمام اشیا کو چھوٹے اور سہل الہضم ٹکڑوں میں تقسیم کر دینا۔ اس ضمن میں کمار

سوامی ایک ایسے صنعتی نظام کا ذکر کرتے ہیں جس میں ''کوئی شخص بھی پورا علم حاصل نہیں کرتا۔ کارکن خاص طور پر اشیا کے چھوٹے چھوٹے اجزا تو گھڑتا رہتا ہے مگر کچھ بھی مکمل صورت میں بنا نہیں پاتا۔'' وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''محنت کی اس حد سے بڑھی ہوئی تقسیم کا نتیجہ ایسے مال کی پیداوار کی صورت میں نکلتا ہے جو کارآمد تو ہے لیکن خوبصورت نہیں۔ کیونکہ تکمیل، ربط باہم اور وضاحت خوبصورتی کی اساس ہیں اور مزدور کا ان سے کیا واسطہ، جو شخص صرف چیزوں کے اجزا بناتا ہے وہ فنکار نہیں صرف ایک قلی ہے۔''[1]

فنکار اور کاری گر کی محنت کی بے شک اپنی ایک خاص عزت ہوتی ہے لیکن ''محنت کی عظمت'' کے بارے میں صنعتی میدان میں جو نمائشی تقریریں کی جاتی ہیں وہ گمراہ کن ہیں کیونکہ وہ اصل بات تک پہنچ ہی نہیں پاتیں۔ روایتی نقطۂ نظر کے مطابق ایسی محنت جس میں کسی بھی رخ سے عمل عبادت کی ''تقلید'' نہ ہو جس میں خالق کی صناعی کا عکس نہ ہو اور جس کی پیدا کردہ اشیا میں سے حسن اور معنویت غائب ہو وہ محنت، ایک آزاد آدمی کے شایان شان نہیں۔ قدر کلیات میں منعکس ہوتی ہے، جزوی ٹکڑوں یا جزوی افعال میں نہیں اور بے قدر اور رائیگاں سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے کارِعبث کے خلاف انسان کی خلقی ناموافقت اس کے اندر ابھرنے لگتی ہے۔ ہماری زندگیاں اتنی طویل نہیں کہ اس بے مصرف طریق پر بتادی جائیں اور اگر ہم انسان کو مکمل اور کسی نہ کسی اعتبار سے پائیدار اشیا سے محروم کر دیتے ہیں اور اسے ایسی چیزیں بنانے کا موقع بھی نہیں دیتے تو مستقبل بعید میں ایسے انسان تیار ہوں گے جو بیماری آزاری کے مارے ہوئے، بے ٹھکانا، بے جڑ لوگ ہوں گے اور وقت کے دھارے میں خس و خاشاک کی مانند بہتے پھریں گے۔

جب لوگوں کو اختیار اور ذمہ داری کے مواقع سے محروم کر دیا جائے تو بے معنویت کا احساس گھن کی طرح کھانے لگتا ہے۔ نیکی کرنے اور اس طرح اپنی کجی کو دور کرنے کا موقع یا بدی کرنے اور اس کو بھگتنے کا موقع، مختصر یہ کہ اپنی روح کی نجات یا تباہی کا اختیار، یہ ہے ذمہ دارانہ فعل کا حق جو انسان سے چھین لیا جائے تو اسے سب کچھ فضول اور مہمل نظر آنے لگتا ہے۔ دراصل آزادی صرف چند بندھنوں سے چھوٹنے کا نام نہیں تا آنکہ وہ بندھن حرکت میں مانع نہ ہوتے ہوں بلکہ کچھ کرنے کا موقع اور یہ کر دکھانے کا نام ہے کہ ہم کیا ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اواخر سے کچھ کرنے کی

1- *The Rg Veda as Land-Nama-Book*, Ananda Commaraswarmy, Lazac dCo.

آزادی کے بجائے چیزوں سے آزاد ہونے کا خبط پیدا ہوگیا ہے۔ گویہ دونوں پہلو اکثر ایک دوسرے پر منحصر ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ نہیں۔

منفی نقطہ نظر یعنی مندرجہ بالا نظریے (چیزوں سے آزادی) کے حساب سے بھی دیکھا جائے تو یہ معاصر مفروضہ محل نظر ہے کہ موجودہ دور سے پہلے انسان نے کبھی ایسی آزادی کا مزہ نہیں چکھا۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ غلامی سے بڑھ کر غیر انسانی اور خبیث نظام مشقت آج تک ایجاد نہیں ہوا۔ حالانکہ غلامی کی بنیادی تعریف یوں کی جاتی ہے: ایک مالک کے ماتحت ہونا اور کسی صورت میں اس سے سرکشی یا اس کی حکم عدولی نہ کرسکنا، (بجز اس کے کہ غیر معمولی ہمت سے کام لیا جائے)، بلاملکیت کے رہنا اور غلامانہ مشقت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہونا۔ حقیقی معنوں میں غلامی کی ضد خود ماجوری (Self-employment) یا ذاتی کاروبار ہے مگر یہ چونکہ معاشی اعتبار سے غیر سودمند اور سیاسی اعتبار سے نراجی ہے اس لیے نہ تو ہمارے صنعتی عہد میں اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی گنجائش ہے نہ ہی سیاسی اجتماعیت اس کی اجازت دے سکتی ہے۔

تاریخ کے ان ادوار میں جب غلامی کا رواج تھا، روکھی سوکھی کھانے والا ایک آزاد مرد ایک غلام سے بہرحال برتر سمجھا جاتا تھا چاہے غلام سونے کا نوالہ ہی کیوں نہ کھاتا ہو اور ریشم وحریر میں ہی کیوں نہ لپٹا ہو۔ فطرت کے قوانین اور حاجات کے سامنے سر جھکانے کو کسی دوسرے انسان کی مرضی کے تابع ہونے سے کہیں زیادہ افضل مرتبے کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ جدید سیاق میں اس سے بھی بڑھ کر یہ تک کہا جاسکتا ہے کہ مؤخرالذکر حالت (جو کہ کم ازکم انسانی تعلقات کے دائرے میں واقع ہے) اس انسان کی حالت سے جو کہ ایک وسیع غیر شخصی نظام کا غلام ہے، کیفیتی اعتبار سے کہیں بہتر ہے۔ جس طرح مزدور اور سفید پوش نوکری پیشہ کا موازنہ کرتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اول الذکر اب بھی مقابلتاً زیادہ آزاد ہے کیونکہ وہ سماجی دباؤ کے تحت اپنے ادارے میں ترقی کی دوڑ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں ہے۔ خیر اب تو ہمیں یقین دلایا گیا ہے کہ بہت جلد مشینیں غیر تربیت یافتہ مزدوروں کی جگہ لے لیں گی۔ اس صورت میں ''ترقی یافتہ'' ممالک میں لوگوں کی اکثریت ملازمت پیشہ ہوگی اور ''ترقی پذیر'' علاقوں میں بھی جہاں تک ممکن ہوا اس روش کو اپنانے کی کوشش کی جائے گی۔ سماجی دولت کی پیداوار کی خاطر انسانوں کو زیادہ سے زیادہ کارآمد طریقے پر استعمال کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی بھی اس جال سے نکل نہ پائے۔

چونکہ اشتراکی بلاک اور ''سرمایہ دار'' محاذ کی اشد ضرورتیں یکساں ہیں اور ان کا مطمع نظر بھی تقریباً ایک ہے اس لیے ان کے حربے بھی روز بروز ایک سے ہوتے جا رہے ہیں۔ جس معاشرے میں ہر شخص بالواسطہ یا بلاواسطہ ریاست کا ملازم ہے وہاں اس شخص کے لیے کوئی جائے فرار نہیں جو ریاست کے تقاضوں کی تکمیل نہیں کرتا۔ اگر نہیں کرے گا تو جائے گا کہاں؟ فی الحال مغرب میں ابھی تک یہ ممکن ہے (اور ہمیں ہر چھوٹی نعمت کے لیے شکر گزار ہونا چاہیے) کہ ایک شخص ایک جگہ سے ملازمت چھوڑ کر اس کے حریف ادارے میں ملازم ہو جائے۔ لیکن ہمیں یہ فرض کر لینے کی حماقت نہیں کرنی چاہیے کہ یہ آزادی ہمیشہ برقرار رہے گی۔ معاشی یکسانیت کا ایک عمل وقوع پذیر ہو رہا ہے جو کہ ظاہر ہے مشینی معاشرے کی بہتر کارکردگی کے لیے ضروری ہے۔ اس عمل کے تحت چھوٹے کاروبار بڑے کاروبار میں جذب ہو جاتے ہیں اور بڑے کاروبار ایسے مشترک مفادات ڈھونڈ لیتے ہیں جو کاروباری رقابت سے بالاتر ہوں جبکہ ریاست ''مفاد عامہ'' کے نام پر ہر دم ان پر مسلط رہتی ہے۔ نئے مالکان اور نئی ملازمت کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں اور ایک ایک کر کے تمام دروازے بند ہونے لگتے ہیں حتیٰ کہ کوئی کھلے خطے یا سمندر پار کی سرزمین باقی نہیں رہتی جن کی طرف فرار ہونے کا انسان کم از کم خواب ہی دیکھ سکے، جس طرح پہلے وقتوں کا غلام پہاڑوں کے پار یا کشتی میں سوار ہو کر فرار ہو سکتا تھا۔ جدید انسان کو تو امیگریشن کے حکام کو مطمئن کرنا پڑے گا اور کام کرنے کا اجازت نامہ حاصل کرنا پڑے گا۔ اپنی سرحدوں کے اندر ریاست کے بڑھتے ہوئے اختیارات کے متوازی حالیہ برسوں میں ایک اور صورت حال نمودار ہوئی ہے جو لوگوں کو ان کے پیدائشی وطن میں مقید کرنے میں مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ جب انسان پر چاروں طرف سے دنیا تنگ ہو رہی ہو تو اس سارے عمل کو خوف کی نظر سے نہ دیکھنا، بند ترسی ..... کی طرف سے ایک غیر فطری بے حسی کو ظاہر کرتا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا جانور بھی شکنجے میں پھنستے وقت کچھ تو پھڑ پھڑاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک نکتہ یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ ملازمت پیشہ کی حالت غلام سے بہت مختلف ہے، وہ فرار یا بغاوت کی صورت میں موت کا خطرہ مول نہیں لیتا۔ اس نکتے پر غور کرنے کے لیے ہمیں سماجی دباؤ اور اس کی داخلی تاثیر کا جائزہ لینا ہوگا۔ موت کا خوف بہت سے ممکنہ دباؤ میں سے ایک ہے۔ مفلسی یا تذلیل اور بے عزتی کا خوف بھی دباؤ کی ایک صورت ہے اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو موت کو بے عزتی پر ترجیح دیتے ہیں اور اس متاع عزیز کو کھونے سے مرنا بہتر سمجھتے ہیں جس کے دم سے زندگی جینے کے قابل ہے۔ بلی کے کھال اتارنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔

یہ کہنا بے سود ہے کہ عام لوگوں میں آزادی کا جذبہ زیادہ ہونا چاہیے۔ یہاں ہم انسانی زندگی کے حقائق کی بات کر رہے ہیں آدرشوں کی نہیں، کیونکہ یہی حقائق نوع انسانی کے مستقبل کا فیصلہ کریں گے۔ آجکل ایسے حالات اور سماجی دباؤ موجود ہیں جن کے تحت لوگ پیشہ ورانہ زندگی کے اختتام یا کسی خاص شعبے میں ناکامی سے بھی اتنے ہی خوفزدہ رہتے ہیں جتنا کسی اور نظام کے تحت موت اور تشدد سے رہتے تھے۔ بہت کم لوگ صرف زیست کی مسرت کی خاطر یا جینے کی خوشی میں جیتے ہیں۔ یا پیار، دوستی، آواز اور بصارت اور لمس اور مہک کے لیے زندہ رہتے ہیں اور جو لوگ دینی مسرتوں یا قربِ خداوندی کی سعادت کے لیے زندہ رہتے ہیں ان کی تعداد اور بھی کم ہے۔ اکثریت، بشمول ان لوگوں کے جو ہمارا سیاسی اور معاشی مستقبل متعین کرنے کا اختیار رکھتے ہیں، لایعنیت اس احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے جو جدید دنیا کو آسیب کی طرح چمٹ گیا ہے کسی نہ کسی قسم کی پیشہ ورانہ کامیابی حاصل کرنے کے محتاج ہیں۔ اُس تحصیل کو ایک سیڑھی کے طور پر لیا جاتا ہے جو چاہے چڑھنے والوں کو کہیں بھی نہ لے جائے لیکن ان لوگوں کو نہایت اہم معلوم ہوتی ہے جو اس سے زیادہ بلندیوں کا علم نہیں رکھتے۔ اس صورت میں کسی شخص کے لیے اس سیڑھی پر جگہ کھو دینے کی تہدید نہایت قوی تعزیری حربہ ثابت ہوتی ہے۔ جب آدمیوں کو تابعدار بنانا مقصود ہو تو تعزیرات کی حقیقی وقعت سے نہیں ان کی داخلی تاثیر سے اصل فرق پڑتا ہے۔

آزادی کو پروان چڑھانے کے لیے سب سے پہلے تو دباؤ کم کرنے کی ضرورت ہے جو ایک معمولی آدمی کو، جو کوئی سورما نہیں ہے، ذمہ دارانہ فکر و فعل سے روکتے ہیں۔ اسے اپنا بوجھ خود اٹھانے اور اپنے فیصلے اور انتخاب خود کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ یہ دباؤ جب تک پوری طرح حاوی نہ ہو جائیں عام طور پر محسوس نہیں ہوتے اور تب مزاحمت کرنا بے سود ہو جاتا ہے۔ جب تک وہ نظام جس کے تحت ہم زندگی گزار رہے ہیں، ہمدردانہ بنیادوں پر کام کرتا رہتا ہے اور اس میں اتنی لچک باقی رہتی ہے کہ فرد کا اور اس کی بے ڈھب ضروریات کا خیال رکھ سکے، ہم اپنے خیال میں ریاست کے اسلحے خانے میں جمع ہونے والی طاقت کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم بڑی طاقتوں کے ہاں ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیرے کو اس خوش گمانی میں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ سمجھ دار لوگ ان موجودہ ہتھیاروں کو استبداد یا تباہی کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ اس قسم کی رجائیت پسندی فطرت انسانی سے گہری لاعلمی کو ظاہر کرتی ہے۔ جب ہم بہت سے مختلف عوامل پر

غور کرتے ہیں جو واضح طور پر ایک ہی سمت میں اشارہ کر رہے ہیں اور ان کے موجودہ رجحان کو مستقبل کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی حفاظت کی بجا طور پر فکر کرنی پڑتی ہے۔ ایک مہربان اور بُردبار آقا کا غلام شاید غلامی کی بیڑیاں توڑنے کی ضرورت نہ سمجھے جب تک کہ وہ اس بات پر غور نہیں کرتا کہ اس کی زندگی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ مالک کی مہربانی کب تک برقرار رہتی ہے! نہتے ہونا کوئی اچھی بات نہیں چاہے ہمارے اردگرد مہربان چہرے ہی کیوں نہ ہوں۔

ملازمت پیشہ لوگوں کا معاشرہ نہ صرف آسانی سے آمریت کو قبول کر لیتا ہے بلکہ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں اکثریت کے پاس ایسی چیزیں بنانے اور کرنے کی ضرورت کی تسکین کا کوئی موقع نہیں ہوتا جن پر اس کی انفرادی چھاپ لگی ہو۔ یہ ضرورت ایک چھوٹے گروہ، قبیلے یا خاندان کی مشترکہ کوششوں کے ذریعے تو پوری ہو سکتی ہے لیکن ایک بڑے ادارے کی غیر شخصی کامیابی اور کارکردگی میں نہیں۔ جس طرح آج کا مزدور صرف اشیا کے چھوٹے چھوٹے اجزا بناتا ہے اسی طرح آج کا ملازمت پیشہ بھی کاموں کے چھوٹے چھوٹے حصے انجام دیتا ہے۔

اس قسم کے اداروں کے اراکین تا آنکہ وہ کسی بہت ہی خاص مرتبے پر فائز نہ ہوں ایک ''لاشئی'' ہونے کے احساس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے اور یہ محض اتفاق نہیں کہ روایتی عقائد میں قدسی کے مقابلے میں دینوی چیز کی تعریف کے لیے یہی اصطلاح استعمال کی گئی ہے (بے ذات)۔ (عالمِ قدسی کی اقلیم ہی دراصل حقیقی وجود، حقیقی معانی اور حقیقی افعال کی دنیا ہے) اس کارکن کی حیثیت تو ایک کیل جتنی بھی نہیں کہ کئی دفعہ ایک کیل نکل جانے سے بھی مشین میں سنگین خرابی واقع ہو سکتی ہے۔ بلکہ یہ تو اس سے بھی زیادہ غیر ضروری اور قابل مبادلہ اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ توانائی یا محنت کی ایک خاص مقدار فراہم کرتا ہے جو کوئی بھی فراہم کر سکتا ہے۔ جن لوگوں کو دل ہی دل میں یہ احساس ہو کہ کام میں ان کا وجود ضروری نہیں اور آسانی سے ان کی جگہ کوئی اور لے سکتا ہے وہ یقیناً اپنے کام کی نوعیت کو بڑھا چڑھا کر بیان کریں گے اور اس کی اہمیت کا ایک غلط اندازہ قائم کر لیں گے۔ اس طرح سچ سے مزید دوری ہوتی جائے گی اور حقیقت سے رابطہ مزید کٹ جائے گا اور ایک بات تو یقینی ہے کہ خود فریبی چاہے وہ عام جسمانی سطح پر ہو یا روحانی سچائی کی سطح پر، جلد یا بدیر حقیقت کے روبرو ضرور آ جاتی ہے اور اس وقت اس کی تباہی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ''سچ نمودار ہوا اور فریب غائب ہو گیا۔ یقیناً باطل طبعاً ختم ہونے والا ہے۔''[1]

۱- *Qur'an*, 17:81.

دو مزید عوامل ایسے ہیں جو ملازمت پیشہ کے داخلی تحفظ اور نتیجتاً اپنی خود داری کے بچاؤ کی صلاحیت کو کمزور کرتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ اسے اپنے کام کا جو صلہ ملتا ہے وہ نہایت مصنوعی ہے۔ اس کی ماہانہ تنخواہ اور اس کے کام یا کارنامے کے درمیان کوئی براہ راست یا لازمی ربط نہیں ہے۔ عمل اور اس کے اجر کے درمیان جو تعلق اور تناسب ہونا چاہیے وہ دھندلا چکا ہے اور اب اسے بہ آسانی فراموش کیا جاسکتا ہے۔ ایسا شخص جسے تجربے نے انسانی زندگی کی جوکھم کے لیے تیار نہ کیا ہو، جب اس کا بے رحم اور تند حقیقت سے ٹکراؤ ہوتا ہے تو وہ سوائے خود کو مظلوم اور ناانصافی کا شکار محسوس کرنے کے اور کچھ نہیں کرسکتا۔ تھائی بوں کے الفاظ میں ''یہ سب میری محنت سے بن پایا اور مجھے اس میں کچھ حاصل ہی نہیں ہوا۔'' یہ ناانصافی ہے یہ سب زیادتی ہے اور زیادتی اور بے انصافی کو پنپنے کا کوئی حق نہیں۔ چنانچہ حقیقت کو حقیقت ہونے کا حق نہیں اور ہر شے الٹ پلٹ ہونی چاہیے۔'' ہمارے زمانے میں بغاوت کا جو بحران وکاز زیادہ تر اسی محدود اور مادی تصورِ انصاف سے پروان چڑھتا ہے جو ایک ایسی سوسائٹی میں راسخ ہے جس کا زندگی کے اولین سرچشموں سے تمامتر واسطہ ختم ہو چکا ہے۔[1]

دوسرا یہ کہ ملازمت پیشہ لوگوں کے معاشرے میں نسلوں کے درمیان کوئی تسلسل نہیں ہے۔ کارکن کی کارگزاری کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو، ساری عمر کی قابل تعریف نوکری کے بعد اس کا عہدہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، جو کچھ اس نے حاصل کیا وہ اس کے ساتھ ہی دفن ہو جاتا ہے اور ایک اجنبی شخص اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اس کا خاندان اس کے کام میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا۔ اس کے بچے ایسی چیز قائم کرنے یا برقرار رکھنے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتے جو آخر کار انھیں ورثے میں ملے گی، بونے اور کاٹنے کے لیے کوئی فصلیں اس کے پاس نہیں اور وہ انھیں کچھ بھی ورثے میں نہیں دے سکتا۔ خاندان کی روزی کے کام میں مشترک دلچسپی اور شرکت خاندان کے افراد کے درمیان سب سے مضبوط بندھن ہوتا ہے چونکہ اس بندھن کو منقطع کردیا گیا ہے اس لیے والدین اور بچوں کے درمیان سوائے خونی رشتے کے اور کوئی مشترک چیز باقی نہیں رہی۔ جانوروں کے بچوں کی طرح انسان کی اولاد بھی دنیا میں تہی دست نکلتی ہے اور بوڑھے لوگ تنہا پڑے موت کو گلے لگاتے ہیں۔

ہماری آنکھوں کے سامنے صدیوں نہیں دھائیوں کے اندر اندر ایک نئی دنیا نے جنم لیا ہے۔ ایک ایسی دنیا جس کی آبادی دست نگر لوگوں پر مشتمل ہے لیکن یہ کس کے دست نگر ہیں؟ اور کن شرائط

۱- *Retour au Reel*, Gustave Thibon, Lardenchet, p.19.

پر ہیں؟ حکومت کی مشینری چلانے والے رہنما چاہے کسی ملک کے منتخب نمائندے ہوں جنھیں عام انتخاب کے ذریعے محض روٹی کپڑا مکان جیسے فوری مسائل کی بنیاد پر چنا گیا ہو، یا زبردستی اقتدار پر قابض ہونے والے، وہ ذاتی مفاد کی خاطر کام کر رہے ہوں یا ملک کی بہتری کی خاطر، ایک بات واضح ہے: یہ لوگ تغیر کی ایسی قوتوں کے تابع ہیں جو ان کی سمجھ سے باہر ہیں اور ان کی اطاعت میں نہ تو وہ غیر متغیر اصولوں کی پرواہ کرتے ہیں نہ ہی روایت اور رواج جس کی ہر روک ٹوک اِن کے لیے مٹ چکی ہے۔ مرکب بے زمام ہو چکا، سفر بے سنگ میل ہے اور اس بات کے کوئی آثار نہیں کہ ان لوگوں کو اپنی سمت کا علم ہو۔

تغیر کی قوتوں کے پسِ پشت محض اندھے اتفاق کو کارفرما دیکھنے کی بجائے ان کے محرّک کو ایک 'شخصی' نوعیت عطا کرنے کی سوچ بے بنیاد نہیں ہے۔ اس کی بہت سی سابقہ مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے اسلاف انھیں بلا جھجک شیطانی قوتوں سے تعبیر کر دیتے کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ انسان یا تو خدا کی اطاعت کرتا ہے یا ابلیس کی۔

بے شک معاصر سیاق میں اس قسم کی زبان بچگانہ معلوم ہوتی ہے گو ہمیں یہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ شیطان بھیس بدل کر کام کرنے میں ہمیشہ کامیاب رہتا ہے۔ ہم مارے بندھے ایک سمت میں دھکیلے جا رہے ہیں، اس نشان راہ سے دور جس کی انسانیت کو عادت ہو چکی تھی۔ اگر ہم یہ نہیں جانتے کہ ''جاتے کدھر کو ہیں''، تو کم از کم یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ ''آتے کہاں سے ہیں''، تاکہ اس نقصان کا اندازہ لگا سکیں جو ہمیں پہنچنے والا ہے۔

باب چہارم

انسان اور معاشرہ

سماجی اور سیاسی اقلیم میں آزادی بھی لازماً ان اضافی اور اتفاقی اچھائیوں کی مانند ہو جاتی ہے جن کی قدر و قیمت ہم رائے عامہ کا رخ دیکھ کر متعین کرتے ہیں۔ اس اقلیم میں کچھ بھی ''مطلق'' نہیں ہے۔ سارا مسئلہ صرف نسبتاً اہم اور نسبتاً غیر اہم کے درمیان توازن اور امتیاز کا ہے۔ لیکن بعض حالات میں کسی اضافی اچھائی کا تحفظ ایک مطلق اور لازوال اچھائی کے تحفظ کی ضمانت بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اضافی میں اس اصول کا رنگ آ جاتا ہے جس کی وہ حفاظت کرتا ہے۔

اگر آزادی کے موجودہ تصور کے حوالے سے دیکھا جائے تو قدیم روایتی معاشروں میں چاہے وہ قبائلی ہوں یا مذہبی پیشواؤں کے زیر نگین، انسان یقیناً ''آزاد'' نہیں تھا۔ ان کی زندگیاں مہد سے لحد تک کردار اور عقائد کے ایسے بنیادی نمونوں پر تشکیل پاتی تھیں جو یا تو ابتدائے آفرینش سے مقرر کر دیے گئے تھے یا اس وقت مرتب ہوئے تھے جب کوئی وحی الٰہی کسی پیغمبر یا رسول کے ذریعے کرہ ارض پر نازل ہوئی اور اس نے انسانیت کے ایک پورے حصے کو زندگی اور موت کے بارے میں ضروری علم فراہم کیا۔ ان حالات میں انھیں کسی اور آزادی کی ضرورت نہیں تھی۔ ''حق تمھیں آزادی بخش دے گا۔''

اس نکتے کی تشریح مندرجہ ذیل تمثال کے ذریعے کی جا سکتی ہے۔ فرض کیجیے کہ دنیا آفتاب ربانی کے تلے پھیلی ہوئی ایک وسیع سرزمین ہے لیکن اس کے کئی خطوں پر دبیز بادلوں کا سایہ ہے۔ آفتاب کی شعاعیں زمین کو خاص خاص نقطوں پر چھوئیں گی اور اس طرح اپنی خلقی قوت کے ذریعے ایسے نقوش تخلیق کریں گی جن کی تابندگی اس خطے پر سے بادلوں کے گزرنے کے بعد بھی قائم رہے گی۔ جو لوگ ایسے کسی منور مقام پر رہتے ہیں اور روشنی سے فیض یاب ہوتے ہیں انھیں اپنی جگہ سے حرکت کر کے کہیں اور جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی لیکن جو تاریکی میں ہیں وہ منجمد ہو کر وہیں کہیں مرکھپ جائیں گے۔ تا آنکہ انھیں نقل و حرکت کی آزادی نہ ہو اور وہ وہاں سے روشنی کی جستجو میں یکہ و تنہا یا تراپر نہ نکل کھڑے ہوں۔

چنانچہ ہمارے نزدیک آزادی کی تعریف یوں ہوئی: تاریکی کے خطوں میں نقل و حرکت کی آزادی! جس قدر تاریکی زیادہ ہوگی اسی قدر اس قسم کی آزادی کو مقدم جانا جائے گا۔ ہم اب تک اس امر کے عادی نہیں ہوئے، جو کہ اب ہمیں ہو جانا چاہیے کہ اساسی اور تیز رفتار تغیرات کے تحت جہاں ہماری حفاظت کے لیے قائم کیے گئے قدیم ڈھانچے ملیامیٹ ہوئے وہاں ترجیحات بھی متعلقہ حالات کی طرح نہایت غیر مستحکم ہو کر رہ گئیں۔

یہ سب گڑبڑ اس لیے پیدا ہوئی کہ ہم ان مطلق اصولوں کے تصور تک سے کنارہ کش ہو چکے ہیں جو ایک غیر متغیر پیمانے کے مطابق تمام اضافی برائیوں اور اضافی اچھائیوں کے درجات متعین کرتے تھے۔ اب تو کسی سیاسی اقتدار یا کسی سماجی سانچے کے مستند یا غیر مستند ہونے کا فیصلہ کرنا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ لوگ بس یہ جانتے ہیں کہ انھیں کیا پسند ہے اور کیا ناپسند ہے یعنی کیا گوارا ہے اور کیا ناگوار: فیصلے کا یہ معیار بدنامی کی حد تک غیر یقینی اور نامعتبر ہے۔ استناد یا جواز کے کسی بنیادی تصور کے بغیر نہ صرف سیاسی اقلیم میں جائز فیصلے کرنا ناممکن ہے بلکہ اس قسم کے تعینات بھی مشکل ہیں کہ کب ارباب اقتدار کی اطاعت کرنا درست ہے اور کب یہ اطاعت گناہ کے مترادف ہے۔

چونکہ کچھ عرصہ پہلے تک انسانوں کے نظریات کا تعین مذہب کے تحت ہوتا تھا، اس لیے صرف مذہبی سیاق ہی میں استناد یا جواز کی وہ تعریف مل سکتی ہے جو صدیوں سے رائج تھی۔ اس سیاق میں جائز اور ناجائز کا تصور ایک نہایت سادہ سے اصول سے متعلق ہے: کوئی انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کی عبادت نہیں کرے گا، کوئی انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کے سامنے سر نہیں جھکائے گا، کوئی انسان دوسرے انسان کی غیر مسؤل اطاعت نہیں کرے گا۔ معبود، مالک اور حاکم صرف ایک ہے اور ہمارے مرتبۂ انسانی کا شرف اتنا بلند ہے کہ ہم اس کے سوا اور کسی کو قبول کر ہی نہیں سکتے۔

یہ تو ہوا اصول! اب ہبوطِ آدم کے بعد کی مبہم اور دھندلی صورت حال میں اس اصول کے جو اطلاقات ہو سکتے ہیں ان میں بے حساب تنوع پایا جاتا ہے۔ ہم نور ربانی کے سائے میں نہیں رہتے، نہ مطلق اصولوں سے ہمارا وہ قریبی ربط رہ گیا ہے۔ ہم تو پرچھائیوں بلکہ عکس در عکس کی دنیا میں رہتے ہیں۔ ساری معلومہ تاریخ میں انسان نے اپنے جیسے انسانوں کی اطاعت کی ہے، ان کے سامنے جھکے بھی ہیں اور کسی کسی موقعے پر ان کی پوجا تک کی ہے۔ لیکن یہ سب کرتے وقت انھوں نے اپنے جیسے بے مایہ اور ناقص انسان کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا بلکہ رب کے آگے سر جھکایا ہے

کہ انسان اپنے منصب کے حوالے سے اور اپنے وقتی تشخص کے چیتھڑا ملبوس کے اندر اسی رب کی علامت ہے اور اسی کا نمائندہ۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ روایتی حاکمِ وقت ایک شفاف وجود رکھتا تھا۔ (حقیقتاً یا مفروضتاً) اس کی رعایا اس کے پار اپنے اصل معبود اور حاکم کی جھلک دیکھ سکتی تھی۔ ایسی زمین جو عرش سے مکمل طور پر منقطع ہو یا ایسا حباب جو غیر شفاف ہونے کے سبب باہر کی دنیا سے کٹا ہوا ہو، ان لوگوں کے لیے نا قابل تصور تھا۔

یہاں ہم ایک ایسی تہذیب کی مثال پیش کرتے ہیں جسے عام طور پر لادین سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہم دین کو سامی مذاہب کے توحید کے تناظر تک محدود سمجھیں تو واقعی ایسا ہی لگتا ہے کہ چینی تمدن میں مذہب کا وجود نہیں۔ لیکن قدیم چین میں تمام اقتدار شہنشاہ کی ذات میں مجتمع تھا اور اس کی اقلیم 'وسطی سلطنت' کہلاتی تھی کیونکہ وہ زمین کے عین وسط میں واقع ہونے کے باعث براہ راست نور ربانی کے تلے تھی۔ مگر یہ شہنشاہ تھا کون؟ ایک معمولی شخص جس کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ اسے فرمان سماوی عطا ہوا تھا وہ عرش اور فرش کے درمیان ایک پل کا کام کرتا تھا اس کی محض موجودگی دنیا کے وجود کو اس طرح قائم رکھتی تھی جس طرح سورج کا محض چمکنا اس کے وجود کو قائم رکھتا ہے۔ مقدس شاہانہ لباس میں اس نے ایسی علامات اوڑھ رکھی تھیں جو عرش سے زمین پر آنے والے پیغامات کے مانند ہوتی تھیں۔ اس کے افعال حتیٰ کہ اس کی حرکات وسکنات تک ایسے آداب کے تحت ہوتی تھیں جو اس کی رعایا کے لیے ایک سماوی نمونہ پیش کرتے تھے۔ اقلیم سماوی کا تحفظ ''منگ تانگ'' کی رسومات طواف سے ہوتا تھا جو ساری کائنات کی علامت تھا۔

اس سلطنت کی سرحد کے اُدھر تبت میں دلائی لامہ ایسے واسطے کا کام کرتا تھا جس کے ذریعے ''بودھی ستوا چنزنگ'' کی برکات اس کی تمام امت تک پہنچتی تھی۔ دوسری طرف اس کے اطراف میں عظیم خانقاہیں نور کے چھوٹے چھوٹے الاؤ کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ گویا تجلی ربانی سے بے شمار شمعیں روشن ہوں اور اس بنجر سرزمین کے کوہستانی مسافر اس الاؤ سے حدت پاتے تھے۔ اشتراکیوں کے ہاتھوں ان خانقاہوں کی تباہی گویا ایک نئے برفانی دور کے تسلط کا آغاز تھا۔

جاپانی فرمانروا کا اقتدار موروثی تھا اور اس کے حصے میں اس لیے آیا تھا کہ ''جی موٹینو' کے وسیلے سے اس کا سلسلۂ نسب سورج دیوی آماترا سو۔ اومی کامی سے جاملتا تھا۔ اس کا لقب ''باب بلند'' (Mikado) تھا یعنی ایک در، ایک دروازہ، ایک آنے جانے کا راستہ! بالفاظ دیگر وہ دیوار میں

ایک جھروکے کی مانند تھا جس کے بغیر جاپانی نسل اس تنگ دنیا میں گھٹ کر مر جاتی۔ اس سے بالکل مختلف سیاق و سباق ہیں (کہ انسانی دنیا رنگا رنگ ممکنات کو سموئے ہوئے ہے) قدیم مصر میں فرعون کی الوہیت شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ حتیٰ کہ رومی بھی یہ جانتے تھے کہ اگر اپنے بادشاہوں کی (جن میں کوئی کوئی مسخرہ نما بھی ہوتا تھا) اطاعت کروانی ہے تو انھیں دیوتا بنانا ہوگا کہ ایک نرے انسانی آقا کی اطاعت صرف غلام ہی کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی ہر نسل میں قبیلے کے سردار آسمانی علامات سے مزین تھے جو ان کے اقتدار اور اس کے منبع کا پتہ دیتی تھیں۔ لبادے یا تاج پہنتے تھے اور یوں اپنے لوگوں کو زندگی کا اور اپنی فصلوں کو بار آوری کا پیغام دیتے تھے اور انتشار میں تنظیم پیدا کر دیتے تھے۔

ہند یورپی دنیا میں جہاں معاشرہ ذات پات کے مراتب کے اعتبار سے تنظیم پاتا تھا، اقتدار بھی منقسم تھا لیکن حکومتِ وقت اوپر سے عطا ہونے والے جواز کی بنیاد پر ہی کام کرتی تھی۔ ہندو کھشتری محض اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والی ایک مخلوق بن کر رہ جاتا اگر اسے برہمن کے ذریعے روشنی نہ موصول ہوتی۔ بالکل اسی طرح جیسے چاند آفتاب سے اکتساب نور کرتا ہے۔ یورپ میں شہنشاہ کی تاج پوشی پاپائے روم کرتا تھا جو مسیح کا نائب تھا اور اس کے بغیر شاہ کے احکامات بے معنی ہوتے تھے۔ کوئی جنگجو، پادری کی دعا اور بشارت لیے بغیر جنگ پر نہیں جاتا تھا۔ ایسے معاشرے ایک نظام آبکاری کی مانند ہوتے تھے، جن میں روحانی پیشوا سے اقتدار، طبقہ اشراف تک اور پھر تاجروں اور عام آدمیوں تک پہنچتا تھا۔ ہر جگہ داستان وہی تھی چاہے تہذیبیں مختلف ہوں۔ عرش پر کھلنے والا ایک جھروکہ جس سے نور ربانی کا نزول ہوتا تھا اور اس نور کو وصول کرنے والا ایک شخص یا اشخاص یا نسل جو صرف اس نور کے پرچار کی خاطر جیتے تھے جس کے بغیر قوم حشرات الارض کے مانند بصارت سے محروم ہوتی۔

ان مقدس معاشروں میں سے کسی ایک کو اگر باقیوں سے الگ کر کے دیکھا جائے تو وہ محدود اور ادھورا لگے گا۔ ہر معاشرے میں تمام انسانی ممکنات میں سے صرف چند کو پروان چڑھایا جاتا تھا حالانکہ باقی ممکنات کو بھی نشوونما کا اتنا ہی حق تھا۔ لیکن تحدیدات اسی کا نام ہیں اور انسانی زندگی تحدیدات سے عبارت ہے۔ ہر تہذیب اور ہر معاشرہ اپنے سماجی اور اخلاقی سانچے کو ایک خداداد معیار یا آسمانی نظام کا پرتو سمجھتا تھا اور اس اعتقاد میں اپنے طرز حیات کی تائید اور جواز تلاش کرتا

تھا۔ لیکن روایتی عقائد میں کون و مکان کی سطح پر معیار خداوندی کے کسی ایک واحد حتمی یا مکمل طور پر موزوں عکس کے امکان کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ تو صرف پارہ پارہ اشکال میں اور بظاہر متضاد نظاموں کی کثرت میں منعکس ہوتا ہے۔

کلیت کا اظہار تنوع میں اور ایسے مظاہر میں ہوتا ہے جو بظاہر تو ایک دوسرے کے مقابل نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ وہ چاہے کتنے ہی محدود کیوں نہ لگیں ان میں سے کوئی بھی دربستہ نظام نہیں تھا بلکہ ان کی مثال تو ان لوگوں کی سی ہے جو پہاڑ کو مختلف جہتوں سے دیکھتے ہیں اس لیے ان کے ''تناظر'' جدا جدا ہیں۔ باوجود یہ کہ کوئی اکیلا معاشرہ کبھی بھی معیار خداوندی کی مکمل و مجسم تفسیر نہیں بن سکتا تھا یا اس کے امکانات کا احاطہ نہیں کر سکتا تھا مگر فرد واحد میں یہ صلاحیت پائی جاتی تھی کہ وہ ایک محدود تناظر کو نقطہ آغاز بنا کر آگے بڑھتا رہے تا آنکہ وہ پورے پہاڑ کا مکمل علم حاصل کر لے۔ اس روایتی دانش کی نظر میں جو ہمیں ورثے میں ملی ہے، یہ علم، مشاہدہ یا مرتبہ وجود سچی اور غیر مشروط آزادی ہے۔ ایسی آزادی جو اقلیمِ حوادث اور اس کے اندر ملنے والی محدود آزادی سے باہر کی چیز ہے۔

ویسے ان حدود کے اندر بھی چند مواقع ایسے تھے جب یہ معاشرے وقتی طور پر انسانی کردار کے مقامی معیاروں کو ڈھیل دے دیتے تھے مثلاً نئے سال کے آغاز کے موقع پر جب پرانی دنیا ختم ہو چکی ہو اور نئی دنیا نے ابھی جنم لینا ہو، رسوم و رواج تلپٹ ہو جاتے تھے۔ یہ گویا اسی بات کی یاد دہانی کروائی جاتی تھی کہ تمام انسانی اقدار اضافی ہیں، جس طرح قرون وسطیٰ کے درباری مسخرے ارباب اختیار کو یاد دلاتے تھے کہ ان کی طاقت محض مقامی ہے اور ان کا کروفر عارضی! ہر چیز اس عہد اولین کی جانب واپس لوٹ جاتی تھی جب ابھی معاشرتی قالب نہیں بنے تھے۔ اسی طرح ہر پیدائش، ہر شادی اور ہر موت وقت کے طبعی عمل میں ایک رخنے کی نشاندہی کرتی تھی ایک آغاز اور ایک انجام جس کے ذریعے تخلیق کا تانا بانا متواتر نئے سرے سے بنا جاتا تھا۔

اس کے مقابلے میں ہماری دنیا نہایت بیزار اور اکتاہٹ کی ماری ہوئی ہے۔ جو تنوع کسی اکیلی انسانی ثقافت کے محدود پن کی تلافی کر سکتا تھا روئے ارض سے غائب ہوتا جا رہا ہے۔ جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے جب انسان کسی دور دراز گوشے کا رخ کرے گا تو اسے وہاں بھی وہی تناظر وہی خیالات اور وہی ماحول ملے گا۔ انوکھی چیزیں اپنے داخلی تاثر میں بہشت کی جھلک کی مانند ہیں لیکن

یہ بچارا ان کی تلاش میں نکلے گا تو اسے ہر جگہ ایک سپاٹ سی یکسانیت ملے گی۔ ایک سی صنعتی تکنیک اور مماثل خیالات و آرا کے عالمگیر ہو جانے کے سبب کرۂ ارض پر ایک واحد تہذیب کا پھیلنا ناگزیر ہو جاتا ہے اور اگر ایسا ہو جائے تو نقش انسانی میں بس ایک ہی رنگ رہ جائے گا۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو یقین رکھتے ہیں کہ یک رنگ انسانیت اپنا جواز وجود کھو بیٹھے گی اور یقیناً اپنے اختتام کو پہنچنے والی ہوگی۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمیں یکسانیت کے واسطے پیدا نہیں کیا گیا اور کوئی بھی چیز جو اپنی تخلیق کے مقصد سے پوری طرح بیگانہ ہو جائے وہ نہ باقی رہ سکتی ہے اور نہ اسے باقی رہنا چاہیے۔

ہمارے زمانے کے لوگوں کے نزدیک اس قسم کے خیالات نہ صرف عجیب ہیں بلکہ جسے 'عقل سلیم' سمجھا جاتا ہے، اس کے مطابق بھی نہیں ہیں۔ اب تو کوئی سچا متشکک بھی ڈھونڈے سے نہیں ملتا جو شک پر بھی شک کر سکے اور کھلے ذہن کے ساتھ ان باتوں کا جائزہ لے سکے جو اس کی بنی ہوئی ذہنی فضا کی روشنی میں ناممکن نہیں تو بعید از امکان ضرور نظر آتی ہیں۔

یہ حقیقت بہرحال اپنی جگہ ہے کہ معلومہ تاریخ بڑے حصے میں اور اس سے کہیں پہلے سے ہمارے جیسے جسم و ذہن رکھنے والے مرد و زن انسانی صورت حال کو، خصوصاً سیاسی اقلیم میں "جواز" کے تصور کو، انھی نظریات کی بنیاد پر سمجھتے تھے۔ ان نظریات کا موجودہ دور میں 'غیر معقول' اور بعید از قیاس نظر آنا مخالف قوت کے زور کا ثبوت ہے۔ یہ مخالف قوت روایتی اصطلاح میں تاریکی، تنزل اور انتشار کی اقلیم سے تعلق رکھتی ہے جس نے نہایت مختصر عرصے میں انسانی سوچ کا رخ پلٹ دیا۔

ہم نہ تو تاریخ کو پیچھے کی طرف لوٹا سکتے ہیں نہ ہی اپنی موجودہ حیثیت سے نظریں چرا سکتے ہیں لیکن ایک تو ہمیں یہ ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ ہم سے بہتر انسان ان باتوں پر یقین رکھتے تھے۔ یہ بات جان کر پھر ہمیں اپنے دور کے مسلمہ مفروضوں کو تنقیدی نظر سے دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اگر ہم ماضی کے بارے میں اس قدر اندھا تعصب نہ رکھتے تو یہ کام شاید اتنا مشکل نہ ہوتا۔ مورخین چاہے جس قدر معروضیت اختیار کرنے کی کوشش کریں، رہیں گے وہ ایک خاص زمانے اور ایک مخصوص تہذیبی ورثے کی پیداوار ہی۔ ایک طرف تو وہ تعصب ہے جو عیسائیت سے ترکے میں ملا ہے جس کا اصرار ہے کہ وحی صرف ایک مرتبہ آئی تھی، دوسری طرف تقدمی ارتقا پر یقین (جو دراصل عیسائیت کی امید پرستی کو یک رخے سطحی انداز میں سمجھنے کا شاخسانہ ہے)۔ ان دونوں عوامل کے باعث عالموں اور سائنس دانوں کے لیے کسی قدیم تمدن کو اُس کے صحیح رنگ میں دیکھنا نہایت

مشکل ہوگیا ہے۔ اوپر سے پچھلی دو صدیوں میں صنعتی مفاد میں ہونے والے استحصال کے باعث ہمارے ذہنوں میں ماضی کا تصور دھندلا گیا ہے۔ اگر مؤرخ کے اختیار میں یہ بات ہو بھی کہ وہ لازوال عوامل کو چھوڑ کر صرف تاریخوں پر غور کرنے کی بجائے معروضیت سے کام لے تب بھی غیر مذہبی مؤرخ صرف خارجی واقعات اور حادثات کے ڈرامے سے آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ قوموں کی روحانی زندگی یا ان کی زندگیوں کی مافوق الارضی جہت اس کی نظر سے اوجھل رہتی ہے۔ کیونکہ یہ زندگی جن سمتوں میں سفر کرتی ہے وہ ان سیاسی و سماجی حالات اور ایسے تمام واقعات سے بہت مختلف ہیں جن کی اخباروں میں یا تاریخ کی کتابوں میں شہ سرخیاں لگا کرتی ہیں۔ ایک تو کھلی تاریخ ہوتی ہے ایک خفیہ تاریخ بھی ہوتی ہے۔ یہ دونوں بالکل متضاد سمتوں میں بھی سفر کر سکتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد پانچ صدیوں تک داستانِ اسلام اس فرق کی ایک مثال پیش کرتی ہے۔ خارجی طور پر اسلام بطورِ دین اور اس کی حکومت اس طرح پھیل رہے تھے کہ اس نئی سلطنت کی فوجیں مغرب میں فرانس تک اور مشرق میں چین تک جا پہنچی تھیں۔ اپنی اپنی رائے پر ڈٹے ہوئے نیک لوگوں میں اختلافات اور دلیرانہ جھڑپیں جاری تھیں اور فتوحات کے بعد تخت و تاج کے لیے مختلف خاندانوں کے درمیان چپقلش چل رہی تھی۔ ''دارالاسلام'' کی آہنی دیواروں میں بے اتفاقی کے رخنے نمودار ہو رہے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ تمام تر افسوس ناک اور دل شکن واقعات ہو رہے ہیں جو سیاست کی دنیا میں ناگزیر ہوتے ہیں۔ دوسری طرف اندرونی یا باطنی طور پر دیکھیے تو روحانیت دھیمے دھیمے آہنگ میں نمو پا رہی ہے اور ایک متانت آمیز اور کریمانہ توازن کے پس منظر میں عرش اور فرش کے درمیان بھرپور رابطہ قائم ہے۔ یہ توازن صرف ان معاشروں کو حاصل ہوتا ہے جن میں ہر رشتہ اور ہر عمل مذہب کے ہاتھوں تشکیل پاتا ہے۔ یہی وہ خفیہ اندرونی تاریخ ہے جو اپنے پیچھے کوئی یادگاریں، کوئی داغ چھوڑ کر نہیں جاتی۔ آخرالامر یہی تاریخ باقی رہ جاتی ہے اور اسی کی قیمت لگتی ہے۔

لیکن قدیم روایتی معاشروں میں تاریخ کے یہ دونوں دھارے ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں تھے۔ خارجی واقعات میں معانی ان کی باطنی معنویت کے سبب پیدا ہوتے تھے۔ بذاتہ حقیر واقعات تبھی وقعت رکھتے تھے جب وہ روحانی صداقتوں کو ظاہر کرتے ہوں اور سیاست کی دنیا میں (جسے معانی کی دنیا سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا) حاکم ہمارے اس ارضی بلبلے سے باہر کا آدمی ہونے کی حیثیت سے وقت کی ریگِ رواں کے درمیان ابدیت کا نقیب ہوتا تھا۔

ہم ایسے معاشروں کو اس وقت تک سمجھ نہیں سکتے جب تک ہم تاریخی واقعات کے بطن میں جھانک کر نہ دیکھیں۔ ان کے اور ہمارے مراتب ترجیحات میں ایک گہری خلیج ہے۔ تبت جو کہ دنیائے جدید کی طاقتوں کے ہاتھوں تباہ ہونے والے عظیم روایتی معاشروں میں سے آخری معاشرہ تھا، اس کے بارے میں ایک معاصر تاریخ نگار نے لکھا ہے کہ جو باتیں ہمیں نہایت ''حقیقی'' اور ''ضروری'' معلوم ہوتی ہیں وہ تبتیوں کے نزدیک فریب نظر یا محض ثانوی اہمیت کی حامل تھیں۔ جبکہ ان چیزوں کا جنھیں وہ اساسی حقیقتیں سمجھتے تھے، ہمارے ہاں کی اکثریت (بشمول اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے) یا تو سرے سے وجود ہی نہیں مانتی یا انھیں موضوعی تخیلات کے دھندلکوں میں جنم لینے والی من گھڑت چیزوں سے تعبیر کرتی ہے۔[1]

ایک ایسا شخص جو ہمارے عہد کے تعصبات اور آرا میں گرفتار ہے کس طرح ان معاشروں کو سمجھنے کی توقع کرسکتا ہے جن کے ہاں انسانی ترجیحات کی ترتیب ہم سے نہ صرف مختلف بلکہ بالکل برعکس تھی یا یوں کہیے کہ اصطلاح میں ''الٹ پلٹ'' تھے۔ ہماری موجودہ صورت حال (اور فکری وضاحت کا جو ہمیں غرہ ہے اس) کی مثال تو اس بڑے سے پیکٹ کی طرح ہے جو چند برس پہلے ایک برطانوی پلیٹ فارم پر دیکھا گیا تھا اور جس پر لکھا تھا ''غلط فہمی سے بچنے کے لیے اس پیکٹ کے نچلے سرے کو اوپر کی طرف کردیا گیا ہے۔'' اگر اس پراسرار سی تحریر کو سنجیدگی سے لیا جائے تو جدید دنیا کو سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

جس قدر کوئی روایتی معاشرہ قدیم ہوگا اتنا ہی اس کی تصویر ہم تک مسخ ہوکر پہنچے گی۔ جن تاریخی شواہد کی بنیاد پر ہم قدیم معاشروں کا کوئی تصور قائم کرسکتے ہیں وہ نہایت مختصر ہیں اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کوئی انسانی معاشرہ جتنا اعلیٰ ہوگا اتنا ہی اس کے پیچھے رہ جانے والا تاریخی مواد قلیل ہوگا۔ ''واقعات'' سے مراد یا تو جرائم ہوتے ہیں یا آفات وسانحات جیسا کہ اخبار بین حضرات کو علم ہوگا اور ان معنوں میں ان معاشروں میں بہت کم کچھ وقوع پذیر ہوتا تھا۔ چنانچہ تاریخ نگار ان کو اپنے جانے پہچانے نمونے میں ڈھالنے کے لیے ان کی شکل بدل ڈالتا ہے اور کسی نہ کسی صورت میں زوال پذیر معاشروں کی تصویر پیش کردیتا ہے۔

۱- Marco Pallis, *The Way and the Mountain*, Peter Owen Ltd, p. 105

ہمارے آباؤ اجداد کے عالمگیر عقیدے کے مطابق زمانہ زوال کی طرف رواں ہے اور ایک وقت آئے گا جب ادوار انسانی ختم ہو جائیں گے۔ زوال کے اس دھارے کے بہاؤ میں کہیں کہیں وقفہ آ سکتا ہے اور اس کی سطح پر ہمیشہ ایسے بھنور بھی بنتے رہتے ہیں جن سے اتار کی بجائے چڑھاؤ کا دھوکہ ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کا رخ کسی صورت موڑا نہیں جا سکتا۔ بہت سے دوسرے معاملات کی طرح زمانے کی حقیقت کے بارے میں بھی جدید تصورات قدیم فکر کی معکوس شبیہیں ہیں جیسے ہر چیز کو محدب عدسے کے ذریعے دیکھا جا رہا ہو۔ ہمارے لیے ہمیشہ 'نیچے' کی سطح پر 'اوپر' کی چھاپ لگی ہوتی ہے، اس لیے ہر پستی بلندی نظر آتی ہے۔

یہاں روایتی تصور زمان اور اس کے ادوار کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں ہے، جس کے مطابق انسانیت کو دورِ زریں کی صبح تاباں سے لے کر، جب آدمی اپنے خالق کے ساتھ اپنائیت اور بے تکلفی سے کلام کرتا تھا، دورِ آہن کے جھٹپٹے تک چار عظیم ادوار سے گزرنا ہے۔ بہرکیف اس بات سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ قدیم روایتی معاشرے، چاہے وہ ہندو تہذیب کی شکل میں ہوں یا قبائلی ثقافتوں کی، وقت کے ساتھ پستی میں گرتے چلے گئے اور جب یورپی تسلط سے تصادم کے نتیجے میں ان کے زندگی کے سانچے چکنا چور ہوئے اس وقت تک وہ تنزل کا شکار ہو چکے تھے۔ (اس سلسلے میں ایک استثنائی مثال جنوبی امریکہ کے ریڈانڈین لوگوں کی ہے جنھوں نے اپنے روایتی تمدن کو زوال کی لپیٹ میں آنے سے بچائے رکھا تھا۔) باقی روایتی معاشروں میں زوال کی ایک نشانی یہ تھی کہ ان کے ہاں سے ہستیِ اعلیٰ کا تصور ناپید ہو گیا تھا اور اس کی جگہ ''آسمانی شکتی'' یا ''ملکوتی طاقتوں'' نے لے لی تھی جن کو دیوی دیوتا کے روپ میں مجسم کر کے پیش کیا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ معاشرے شرک اور بت پرستی میں مبتلا ہو گئے تھے۔

دوسری نشانی یہ تھی کہ الوہی حق بادشاہت کے تصور اور اس کے ارضی تحقق کے درمیان خلیج دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ یہ اتنی واضح ہو گئی کہ اسے پاٹنا ممکن نہیں رہا اور یہ اصول ہی من گھڑت نظر آنے لگا کہ اقتدار اعلیٰ اصل میں ذات ربانی سے ماخوذ ہے۔ مؤرخ جب اس اصول کو اپنے موجودہ تقدمی (Progressive) منظر نامے کے حوالے سے دیکھتا ہے تو اس کا دھیان فوراً ان تنزل پذیر مثالوں کی طرف جاتا ہے جو اس کے مطالعے کی پہنچ میں ہیں اور وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ حالات سدا سے ایسے ہی رہے ہیں۔ وہ یہ فراموش کر دیتا ہے کہ یہ افسانہ — یہ زوال یافتہ صورت — اصل صورت کی محض گونج یا بھونڈی تحریف (Parody) ہوتی ہے۔

اس حقیقت سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تنزل واقع ہو چکا ہے اور جن معاشروں میں ان کا مرکزی تصور اوجھل ہو چکا ہو وہ نہایت آسانی سے اس کی زد میں آجاتے ہیں۔ ہوائے تغیر کا ایک ہلکا سا جھونکا ان کے قدیم اور پر تعظیم قالب کو خاک میں ملانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پھر اس طرح ہوتا ہے جس طرح بچوں کی ایک مشہور کہانی میں ہوا تھا۔ کوئی ایک بچہ پکار اٹھتا ہے کہ بادشاہ ننگا ہے اور سارے ہجوم کی آنکھیں یک لخت کھل جاتی ہیں اور انھیں خود پر حیرت ہونے لگتی ہے کہ آخر وہ اب تک اس ننگ دھڑنگ آدمی، اس اپنے جیسے انسان کو، کیونکر خلعت شاہانہ میں ملبوس سمجھتے رہے۔

یہ سارا عمل بہر حال ناگزیر ہے، لیکن بائبل کے مطابق یہ ایک طرح سے دوسرا ''ھبوط آدم'' ہے۔ پہلی دفعہ جب آدم کا ھبوط ہوا تو اسے جنت سے نکال دیا گیا تھا چنانچہ اس نے زمین کے ویرانے میں باغ بہشت کا نقشہ پیدا کرنا چاہا اور وہاں کی کچھ عادات اپنائے رکھنے کی کوشش کی۔ ہونی شدنی، ویرانہ آخر ویرانہ ہے، باغ بہشت نہیں بن سکتا، یادداشت کے نقوش مدہم پڑ جاتے ہیں اور عمل میں کمی آنے لگتی ہے حتیٰ کہ بچے کھچے آثار بھی وقت کی آندھی اڑا لے جاتی ہے اور ہم خود کو ڈھلتی شام اور بڑھتی ہوئی خنکی میں تنہا پاتے ہیں۔ مزید برآں اگر ہبوطِ اول کے سبب خیر و شر کا شعور اور تمیز پیدا ہوئی تھی تو ہبوطِ دوم میں یہ شعور امتیاز زائل ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ نیکی اور بدی کے محض تصورات باقی رہ جاتے ہیں۔

اس ہبوطِ دوم کے ساتھ ہی نوعِ انسانی ایک نئے عہد میں داخل ہوتی ہے، ایسا عہد جس میں اب روایتی معنوں میں کوئی جائز حق اقتدار باقی نہیں رہا۔ یوں مکمل طور پر لادینی معاشرے وجود میں آجاتے ہیں۔

گو ایسی مثالیں بھی موجود ہیں جب کوئی قدیم خدا مرکز معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا یا راتوں رات ملیا میٹ کر دیا گیا، لیکن عام طور پر یہ عمل رفتہ رفتہ واقع ہوتا ہے اور کئی جگہوں پر تو بعض روایتی اقدار یعنی ''عاداتِ بہشت'' سماجی ڈھانچے میں مکمل تبدیلی کے بعد بھی قابلِ احترام سمجھی جاتی ہیں۔ ایسی باقیات کئی دفعہ صدیوں تک زندہ رہتی ہیں چاہے انھیں استوار کرنے والے مابعد الطبیعیاتی اور مذہبی نظریات کب کے فراموش کیے جا چکے ہوں بالکل اس طرح جیسے پودے کے مرجھا جانے کے بعد بھی اس پر سے توڑے گئے پھول گلدانوں میں مہکتے رہیں۔ چنانچہ صورت حال نہایت پیچیدہ ہے اور جب عرش کو فرش سے، جنت کو دھرتی سے ملانے والے راستے جھاڑ جھنکاڑ سے اٹ جائیں تو ہم بدترین سے بچنے کے لیے بد کو قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور اس مایا ڈھیر میں

اندھوں کی طرح اپنی حسّ ترجیح کو ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں جو اس طرح اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے جیسے تیز ہوا میں بادل۔

ان حالات میں یہ بہت اہم ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بھی غرق ہونے سے بچایا جا سکتا ہے اسے بچا لیا جائے۔ ویسے تو جو قدیم اصول سمجھ سے باہر ہوں، نرے فسانے سمجھے جانے لگتے ہیں لیکن یہ فسانے بھی قابل قدر ہیں اگر ان سے کسی ایسی اقلیم کو سہارا میسر ہو جو انسان کو اب بھی تحفظ اور تقویت فراہم کر سکتی ہے اور ایک کور نگاہ معاشرے میں اسے انفرادی طور پر سرچشمۂ نور کی دریافت سے نہیں روکتے۔ روایتی معاشروں کی ازلی کلیت اور لادین اجتماعی (totalitarian) معاشروں کی ظلمت کے بیچ میں ایک غیر معین علاقہ واقع ہے جو دونوں میں سے کسی سے بھی متعلق نہیں اور کچھ مبہم سا ہے۔ اس کا رابطہ اوپر سے تو کٹ چکا ہے لیکن نیچے سے ابھی ابلیسی اور انسانیت شکن طاقتوں کی یلغار کا راستہ نہیں کھلا۔

یہ ایک نہایت مخدوش صورت حال ہے کیونکہ فطرت خلا کو گوارا نہیں کرتی اور جب نظامِ ربانی کا عکس غائب ہو جائے تو اس کی جگہ کچھ اور چیزیں در آتی ہیں 'خانۂ خالی را دیو می گیرد'۔ دنیا سی-ایس-لوئیس کے الفاظ میں ایک ''ساکت سیارہ'' بن جاتی ہے، لیکن اس قسم کے مسدود نظام میں کم از کم وہ قالب عمل تو میسر آ سکتا ہے جس میں انسان آزادی کے ساتھ سچ کو تلاش کر سکے اور اپنی نجات کا سامان کر سکے۔ ان حالات میں تو کوئی بھی حقیقت پسند شخص اس آزادیِ انتخاب کو باقی تمام چیزوں پر ترجیح دینے لگے گا۔

'غیر جانبدار' یا غیر معین معاشرے کا ڈھانچہ لازماً بے قاعدہ ہوتا ہے۔ وہ بے ترتیبی کا شکار ہوتا ہے اور عموماً بدعنوانی میں ملوث ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نظام ربانی سے محروم تو ہو چکا ہے لیکن ابھی شیطان کی مہلک آمریت سے محفوظ ہے۔ بہت سے قابل لوگ اس صورت حال کو ناقابل برداشت جان کر اس کی کجی اور بے تکا پن دور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اُمید رکھتے ہیں کہ اس طرح ایک زیادہ ''معقولیت پسند'' معاشرہ وجود میں آ جائے گا۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نظام کی براہ راست ضد بدنظمی نہیں ہے۔ کسی نظام قدسی کی ضد اس کا عکس مقلوب یعنی ایک جہنمی نظام ہوتا ہے اور ان دونوں کے درمیان میں پراگندگی اور بے ترتیبی کی ایک غیر معین اقلیم ہے۔

وہ لوگ جو معاشرے کے امن و امان اور خوش نظمی کو ہر شے پر مقدم جانتے ہیں وہ اصولاً اس سے اختلاف کریں گے لیکن عملی طور پر اس سے انکار ممکن نہیں۔ جیل کی صعوبتوں میں عمر قید بھگتنے والے یا سائبیریا کے مشقتی کیمپوں کے باسیوں سے پوچھیے، وہ بجا طور پر آزادی کو اپنی موجودہ حالت پر ترجیح دیں گے، چاہے اس آزادی کی خاطر بے انصافیوں اور ابتر معاشرتی حالات کے درمیان بھی کیوں نہ رہنا پڑے۔ اپنی تنگ و تاریک کوٹھڑی کی سلاخوں میں سے دور آسمان پر اڑتے پرندے کو تکنے والا قیدی تحفظ اور آزادی کے فوائد کا موازنہ کرنے میں اخلاقی یا فکری اعتبار سے کوئی ہرج محسوس نہیں کرتا۔ اس کا ٹکراؤ انسانی صورت حال کی حقیقت سے ہے۔ لیکن جب کسی شخص کو رفتہ رفتہ، نرمی سے، پیار سے، پچکار کر قیدی بنالیا جائے تو اسے نہ تو انتخاب کا لمحہ نظر آتا ہے نہ وہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ بات معاشرے کے افراد کے علاوہ ایک انتہائی وسیع سیاق پر بھی صادق آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک پر اپنی مختصر زندگی میں ایک لمحہ ایسا آتا ہے جب ہم اپنے لیے جنت یا جہنم میں سے ایک کی دائمی شہریت کا انتخاب کر لیتے ہیں۔

سماجی اقلیم میں نظم و ترتیب ایک نہایت اہم اضافی اچھائی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہمیں آزادی اور نظم، ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے، ہم سب یقیناً یہی پسند کریں گے کہ ان دونوں کو یکجا کر دیا جائے اور ان کے درمیان ایک معقول توازن ہو۔ اگر ہم ایک ہی وقت میں بہت سی اچھی چیزوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔ مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب دو یا دو سے زیادہ اچھی چیزیں عملی طور پر ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتیں یا مطابقت نہیں رکھتیں اور ایسی صورت میں ترجیحات کا پیمانہ ترتیب دینا پڑتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''غیر معین'' معاشروں میں رہ کر جو مافوق الطبعی توثیق سے محروم ہوں، ہم ان دو نظاموں کے درمیان کس طرح تمیز کر سکتے ہیں؟ وہ سماجی نظم جو انسانی زندگی کے لیے محکم سہارا فراہم کرتا ہے اور دوسرا وہ جو ہمارے امتیازی انسانی اوصاف ہی کا گلا گھونٹنے پر تیا رہتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے تو حقائق کا پوری طرح سامنا کرنا ہوگا اور یہ جان لینا ہوگا کہ ایک مقدس روایتی حکومت کے لیے ہم جو وفاداری اور انس محسوس کرتے ہیں وہ ایک لادینی ریاست کے ساتھ بے محل لگتا ہے۔

چونکہ آپس میں جھگڑتے رہنا ہمارے مفاد میں نہیں ہے اور اس دنیا میں پنپنے کے لیے کسی نہ

کسی حد تک آپس میں تعاون ضروری ہے، اس لیے کوئی نہ کوئی سماجی قالب بنانا پڑتا ہے اور کسی مرکزی اقتدار اعلیٰ یا حکومت کا موجود ہونا بھی لازمی ہے۔ لیکن ریاست یا معاشرے سے سہارا اور تحفظ طلب کرتے وقت ہمیں نہایت محتاط رہنا پڑے گا کہ ہمارا سامنا ایک خطرناک درندے سے ہے، کہیں اس کی حفاظتی آغوش ہمارے لیے پھندا ہی نہ بن جائے۔ گود میں گھٹ کر مر جانا وہ قیمت ہے جو ہمیں تحفظ کے لیے ادا کرنی پڑتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے سیاسی مفکرین اس امر سے اچھی طرح آگاہ تھے لیکن ہمارے نظریہ پرست دور میں یہ بات اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ جس تناسب سے مملکت کا روایتی جواز غائب ہوتا جاتا ہے اسی تناسب سے ہم پر اس کے حقوق اور مطالبات بھی کم ہو جاتے ہیں۔ جب مملکت اپنے سے بالاتر سطح حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتی تو پھر اس کی حیثیت ہمارے خادم کی سی ہونا چاہیے جس کا کام ہمیں تحفظ اور چند بنیادی سہولتیں فراہم کرنا ہے ــــ ایک قسم کا عظیم الشان، واسا ادارۂ آب رسانی و نکاسیِ آب۔

لادین ریاست زیادہ سے زیادہ ایسا آزاد قالب مہیا کر سکتی ہے جس میں مرد و زن اپنے امکانات کو عملی جامہ پہنا سکیں یا سکاٹ لینڈ کی ایک ضرب المثل کے مطابق ''اپنی قسمت اپنے ہاتھ'' اور اپنے طور پر انتخاب میں آزاد ہوں۔ جو ذمہ داریاں پہلے فرد کے شانوں پر تھیں یہ انھیں اپنے ذمہ لینے کی بجائے فرد ہی پر چھوڑ دے گی اور ایسے حالات پیدا کرے گی جن میں شخصی ذمہ داری کے استعمال کی حوصلہ افزائی اور اس کے استعمال میں جہاں تک ممکن ہو سہولت پیدا ہو سکے۔

آخری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد گستاؤ تھائی بوں اور ان کی سابقہ شاگرد سیموں ویل نے اس معاشرے کا خاکہ بنانے کی ٹھانی جو جنگ کے بعد فرانس میں تعمیر ہونا چاہیے تھا۔ یہ دونوں حقیقت پسند تھے اور یوٹوپیا جیسی خیال پرستی کے مخالف تھے اور مرد و زن کے طبعی میلانات کو (جیسا کہ وہ واقعتاً ہیں نہ کہ جیسا انھیں ہونا چاہیے) سماجی فرائض سے وابستہ کرنے کی اہمیت کو سمجھتے تھے۔

تھائی بوں لکھتا ہے ''ذاتی مفاد سے الگ ہو کر نیکی میں وہ وزن باقی نہیں رہتا جو اسے مجسم کر سکے یا زمین سے باندھ سکے۔ دوسری طرف ذاتی مفاد بھی نیکی سے علیحدہ ہو کر وہ قوت پرواز کھو بیٹھتا ہے جو اس کی نجات کی ضامن ہے۔ پھر اسے عرش کی بلندیوں تک لے جانے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ یوں حقیقی اور مثالی کے درمیان علیحدگی ہو جاتی ہے۔ ایک طرف تو ایک زبانی اور ناقابل عمل اخلاقیات ہے اور دوسری طرف غیر متوازن انانیت کا نراجی جمگھٹا جو ایک دوسرے کو نگل

جاتی ہیں۔ اس کا ناگزیر نتیجہ افراد کی ذلت اور معاشروں کے انحطاط کی صورت میں نکلتا ہے۔''[1]
تھائی بوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے اردگرد نظر آنے والے معاشرے اس پروقار اور حقیقت پسندانہ طرزِ حیات سے کتنے دور ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ قرونِ وسطی کے عیسائیوں کو صرف ایک حقیقی دشمن نظر آتا تھا اور وہ تھا انفرادی گناہ! ''آج ہمیں ایک زیادہ ہمہ گیر اور قوی شر کے خلاف جنگ کرنی پڑتی ہے، ایسے انتشار کے خلاف جو ہمارے جسموں، ہمارے رسوم ورواج، ہمارے اداروں میں سرایت کر گیا ہے، جس نے ہمارے سانسوں تک کو زہر آلود کر دیا ہے۔''

معاشرے میں ایسے انسانوں کا وجود بہت ضروری ہوتا ہے جو ایک وسیع تر ذمہ داری بجالاسکیں۔ ایسی ذمہ داری جس کی بنیاد کاروبار دنیا میں جنم لینے والے سطحی اصولوں یا اخلاقی بندشوں پر نہیں بلکہ ان سے زیادہ ہمہ گیر، مرکزی اور مطلق اقدار پر ہوتی ہے۔ ایسے افراد کا وجود تازہ ہوا کی مانند ہوتا ہے اور ان کے بغیر معاشرہ بے حس اور ماحول مسموم ہو جاتا ہے۔ اقلیم قدسی سے باہر جو بھی قالب بنائے جاتے ہیں وہ محض عارضی گزارے کے لیے ہوتے ہیں: ان میں جان ڈالنے والے اور انھیں جواز فراہم کرنے والے یہی لوگ ہوتے ہیں جن کی روزمرہ زندگی تو انھی حد بندیوں میں گزرتی ہے لیکن ان کے قلب کہیں اور ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ حکومت کے احکامات یا منصوبہ بندی کرنے والوں کی اعلیٰ کارکردگی کے نتیجے میں نمودار نہیں ہوتے: ان کا تعلق تو اتفاقات کی اور آشفتہ سروں کی دنیا سے ہوتا ہے (کہ فوق الارض اور روحانی دنیا ہمیں بظاہر ایسی ہی نظر آتی ہے) معاشرے میں یہ لوگ اسی صورت میں کھپ سکتے ہیں جبکہ وہ وسیع تر آزادی کا حامل ہو۔

اب ہم نسبتاً نچلی اور حادث سطح کی بات کرتے ہیں۔ معاشرے میں فضا کی تازگی تب برقرار رہتی ہے اگر اس میں ان گروہوں کے لیے گنجائش موجود ہو جن کو آپ یہ چھوٹ دیں کہ وہ غیر پیداواری اور بظاہر بیکار مشاغل اختیار کر سکیں، خوابوں سے کھیلنے اور تخیلات میں مگن رہنے کی ہمت کریں، ایسی نئی راہوں کا کھوج لگانے کے قابل ہوں جہاں معروف اکثریت کے قدم نہیں پہنچ سکتے۔ جو لوگ اپنے معاشرتی کردار کو نہایت سنجیدگی سے لیتے ہیں، یہ گروہ ان کا مضحکہ اڑا سکیں اور عملیت کے تقاضوں کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت رکھتے ہوں۔ بالفاظ دیگر یہ وہ افراد ہیں جو متبادل تناظر تجویز کرتے اور دربستہ معاشروں میں تنوع کا عنصر داخل کرتے ہیں جس کے بغیر ایسے

1- Gustave Thibon, *Retour are Real*, Landenchet, p. 161.

معاشرے مکمل یکسانیت کا شکار اور روبہ تنزل ہوجاتے ہیں۔ معاشی دباؤ تلے دبے ہوئے لادینی معاشروں کے شہری جن چیزوں کو (خالص مادی معنوں میں) ''غیر اساسی'' سمجھتے ہیں انھیں مستقل رد کرتے رہتے ہیں اور یوں اپنے میدان توجہ کو محدود کر لیتے ہیں جس طرح مویشی صرف اپنے سامنے نظر آنے والے گھاس کے قطعے سے واسطہ رکھتے ہیں۔ لیکن اب چونکہ وہ مویشی تو ہیں نہیں اس لیے ہوا متعفن ہوجاتی ہے اور اس تعفن سے نجات کی ایک ہی صورت ہے کہ ان کی دنیا کو ایسے مرد وزن کے وسیلے سے تازہ ہوا فراہم ہوتی رہے جو ان کی قبیل سے تعلق نہیں رکھتے۔

بلاشبہ ''غیر جانبدار'' معاشرے کا مائل بہ یکسانیت ہونا ناگزیر ہے۔ گویا کشش ثقل اسے نیچے کی جانب کھینچ رہی ہو۔ اقلیم انسانی میں پائی جانے والی کثرت اور رنگارنگی، اس بھرپور تنوع کا عکس ہے جسے نور سماوی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ جب یہ نور معاشرے سے خارج ہوجائے تو افلاس کا ایک عمل شروع ہوجاتا ہے۔ تنوع جو کہ یکتا موجودات میں ظاہر ہونے کے باعث اعداد کی گرفت میں نہیں آتا، اس کی جگہ نری کمیت لے لیتی ہے، ایسی کمیت جس میں کوئی وقعت یا معنویت نہیں ہے کیونکہ وہ قابل مبادلہ اکائیوں پر مشتمل ہے۔

ایک وقت ایسا تھا جب کسی شخص کی بربادی کا سامان کرنا ایک سنگین معاملہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ اپنی ذات میں یکتا ہونے کے سبب اس کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا تھا جبکہ انبوہ کی ایک اکائی کا تباہ ہوجانا قطعاً غیر اہم ہے اور ہماری صدی کے عظیم اجتماعیت پرست معاشروں نے یہ بات بجا طور پر جان لی ہے۔ اس طرح انفرادی یکتائی اور ''صورتِ الٰہی پر تخلیق کیے گئے'' مرد وزن میں پائی جانے والی وقعت کے تصور سے محروم ہوجانے کے بعد وہ وقعت کو کسی اور جگہ تلاش کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں اور انھوں نے اسے اجتماع میں، ''جمہور'' یا ''عوام'' میں پالیا ہے، اس نقطۂ نظر کے تحت اجتماع کی خاطر فرد کی قربانی کو صحیح ثابت کیا جاسکتا ہے۔

غیر جانبدار معاشرہ اس اتھاہ غار پر معلق ہے اور اس کی طرف کھنچ رہا ہے۔ ایسا معاشرہ نورِ سماوی کی ضو میں رہنے والے سالم روایتی معاشرے (چاہے یہ ضو کتنے ہی تنگ سوراخ سے چھن کر کیوں نہ آرہی ہو) اور آمرانہ اجتماعیت کے درمیان (جو روایتی معاشرے کی شبیہ معکوس یا تحریف مضحک ہے) ایک عبوری مرحلے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس لیے یہ کوئی حیران کن بات نہیں کہ ہمارے اندر روایتی معاشروں کی وحدت کے لیے ایک

گہرا مگر لاشعوری ناسٹلجیا پایا جاتا ہے اور ہم ایک نچلی سطح بلکہ ضرورت پڑنے پر تحت الانسانی سطح پر بھی سماجی ہم نوعی کی سعی کر سکتے ہیں: ایسی ہم نوعی جو ریوڑ یا چیونٹیوں کی ڈھیری میں پایا جاتا ہے۔ ان معاشروں میں وحدت کے ناسٹلجیا کی پھر بھی ایک قسم کی تسکین ہو جاتی ہے جہاں فرد مکمل طور پر جمہور میں کھپ کر رہ جائے، ایسے جمہور میں جو صرف مشقت کرنے اور بچے جننے کے لیے زندہ ہو۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان اسی حالت میں زیادہ خوش رہتا ہے، خاص طور پر جب اسے ''بہتر روٹی، کپڑا اور مکان'' بھی میسر ہو، ان سے ہم جھگڑا نہیں کریں گے۔ لیکن ان کے دعویٰ کے اس در پردہ مفہوم کی مخالفت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سطح پر خوش رہنا ہی انسان کا اصل مقصود ہے۔ بہت سے دوسرے معاملات کی طرح، یہاں پہنچ کر بھی مومن اور منکر کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان کوئی ایسی قدرِ مشترک باقی نہیں رہتی جس کے تحت مکالمہ یا مباحثہ ہی ممکن ہو سکے۔ بلاشبہ یہ دونوں جانی دشمن ہیں اور آخر دم تک نبرد آزما رہیں گے۔

جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ جدید دنیا کے اندر جو آزادی کے چند خطے گھیرے میں آنے سے بچ رہے ہیں، ان کا ہر قیمت پر اور ہر ممکنہ حد تک دفاع کس قدر اہم ہے، انھیں اس بات سے دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ ایک جنگ مغلوبہ لڑ رہے ہیں۔ اچھائی کا دفاع، چاہے یہ اچھائی عارضی ہی کیوں نہ ہو، کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ ذرا سوچیے تو کہ آسمان تلے کونسی چیز حتمی یا زیادہ عرصے باقی رہنے والی ہے؟ ہاں مگر ایک چیز ایسی ہے اور وہ ہے وہ چناؤ یا انتخاب جو کوئی بھی مرد یا عورت صف بندی کے وقت کرتا ہے۔ یہ چناؤ کہ اسے کس کی صفوں میں شامل ہونا ہے۔ یہ جنگ دنیاوی فتح یا ''انسانیت کے مستقبل'' کی خاطر نہیں بلکہ اپنا جواز فراہم کرنے کے لیے لڑی جاتی ہے۔ ہم ایک وسیع و عریض ناٹک گھر میں موجود ایک چھوٹے سے سٹیج پر اپنا کردار ادا کرتے ہیں ــــ عین ممکن ہے کہ اپنی بساط بھر کوشش کے بعد، ہزیمت خوردہ اور مغلوب ہو کر ہم جنگ میں کام بھی آ جائیں مگر ایک بات کا ہمیں یقین ہوگا کہ وہ قوت و قدرت جو ہماری تابع ہر قوت سے عظیم تر ہے، وقت آنے پر ''ساکت سیارے'' پر چھا جائے گی اور آج جو طاقتیں ہمیں ناقابل تسخیر دکھائی دیتی ہیں وہ اس طرح معدوم ہو جائیں گی جس طرح سورج کی تمازت سے شبنم کے قطرے بھاپ بن کر اڑ جاتے ہیں۔

چنانچہ یہ ہمارا منصب نہیں کہ استفسار کرتے پھریں کہ ہمارے بنائے ہوئے ریت کے قلعے کتنی دیر چلیں گے، یا مسرت سے اس لیے منہ موڑ لیں کہ جلد یا بدیر غم اس کو نگل لے گا، یا پھر صرف ان

بستیوں کی حفاظت اپنے شایان شان سمجھیں جنھیں ہمیشہ رہنا ہے۔ ہمیں تو صرف لمحۂ حاضر سے اوران چیزوں کے بچاؤ سے مطلب ہے جو بچاؤ کے قابل ہیں اور ہمیں اس خیرِ مستعجل کا انتخاب کرنا ہے جو خیر محض ولم یزل کا عکس ہے۔ لیکن یہ کام جذباتی التباس یا خوش فہمیوں کی بنیاد پر تو ہونے سے رہا۔ جس طرح حق تعالیٰ کی طرف مستقل متوجہ رہنا تمام اعمال دینی کی اساس ہے، اسی طرح ایک ہوشمند حقیقت پسندی یعنی حقائق کی طرف توجہ، دنیا میں مؤثر عمل کی نہاد ہے۔ محافظ کو اپنے قلعے کی دراڑوں اور اپنے مورچوں کی حالت کا پورا اندازہ ہونا چاہیے۔

جدید دنیا میں جو نسبتاً آزاد ''غیر جانبدار'' معاشرے باقی بچ رہے ہیں وہ یا تو زیادہ تر معاشی دباؤ تلے دبے ہوئے ہیں یا ''ترقی'' اور ''مساوات'' کے معاصر نظریوں کے مطابق اپنے معاشرتی قالب کی پیوندکاری کے دھیان میں اور یوں اپنی آزادی کی طرف سے خواب غفلت میں پڑے ہیں۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت کسی نہ کسی طریقے سے آزادی کو تحفظ فراہم کر دیتا ہے اور اگر آزادانہ انتخابات باقاعدہ وقفوں سے ہوتے رہیں تو باقی حفاظتی اقدامات کو آسانی سے خیرباد کہا جاسکتا ہے۔ اگر بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ منتخب ہونے والوں کی اکثریت دال روٹی کے مسائل سے زیادہ انفرادی آزادی کے تحفظ کی فکر میں ہے، تب بھی یہ ایک نہایت مشکوک دعویٰ ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس میں ستم ظریفی یہ ہے کہ جو حالات بنیادی طور پر اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ لوگوں کو اپنے معاملات پر حقیقی اور مؤثر اختیار ہونا چاہیے، وہی حالات اس اختیار کو ناممکن بھی بنا دیتے ہیں۔

روایتی معاشروں میں جو صدیوں کے سفر میں بہت کم تبدیل ہوتے تھے، فرد کو ایسے ازلی رسم و رواج اور سماجی نمونوں کا تحفظ میسر تھا جو ناقابل انحراف سمجھے جاتے تھے۔ اس کے حاکم بھی اس عرف و عادات کے پابند تھے، ان کی طاقت چند اصولوں کی پابند تھی اور وہ اس میں اپنی طرف سے کچھ اختراع کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان معاشروں کو ان معنوں میں جمہوریت کی کوئی حاجت نہیں تھی جن معنوں میں ہم اب جمہوریت کو لیتے ہیں، پھر بھی ان میں سے بہت سے معاشروں میں جمہوریت کی ایک نہایت عملی صورت موجود تھی، مثال کے طور پر افریقی قبائلی نظام میں۔ آج کل کے اجتماعی دور میں بھی یہ اصول کہیں کہیں چھوٹے گروہوں یا طبقات میں کارفرما نظر آجاتا ہے۔ مغربی ساموا کے لوگوں نے آزادی ملنے کے بعد اپنے لیے جدید پارلیمانی حکومت کے مقابلے میں اپنے قدیم 'متائی'

نظام کا انتخاب کیا۔ اس نظام کے تحت حق رائے دہی صرف زمیندار قبیلوں کے سرداروں تک محدود ہوتا ہے اور ان سرداروں کو ان کے قبیلے کے افراد منتخب کرتے ہیں، جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ اس قسم کی مثالیں ہماری دنیا میں (جو جھوٹے خداؤں سے پٹی ہوئی ہے) شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں مگر وہ چند ایسی ممکنات کی نشاندہی ضرور کر جاتی ہیں جو اب بھی قابل عمل ہیں۔

تیز رفتار تبدیلی کے جن حالات میں ہم رہ رہے ہیں، ان میں حاکم اور محکوم دونوں ہی موجود فیشن کے علاوہ اور کسی لحاظ کے پابند یا اس کی حفاظت میں نہیں ہیں۔ ایسے فیصلے کیے جاتے ہیں اور ایسے نئے قوانین وضع کیے جاتے ہیں جو فرد کی زندگی کو بہت مختصر عرصے میں بدل سکتے ہیں تاکہ اُسے، اُس کے خاندان اور اس کے کام کو اجتماعی ترقی کے کسی تازہ ترین منصوبے میں کھپایا جا سکے۔ آج کے انسان کو ہمیشہ سے زیادہ، اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اقتدار کی باگیں کسی نہ کسی حد تک اس کے ہاتھ میں بھی ہوں یا کم از کم وہ اس حد تک بااختیار ہو کہ اس اقتدار کے بے دھڑک، ناجائز اور جلد باز استعمال کو روک سکے۔ تاہم دوسری طرف مسئلہ یہ ہے کہ جدید تہذیب کی پیچیدگی اور صنعتی معاشروں کے انتظامی مسائل کے سبب حکومت اس وقت تک مؤثر طور پر کام نہیں کر سکتی جب تک وہ فرد کی مداخلت اور رکاوٹ سے مبرّا نہ ہو۔

اس ضمن میں تھائی بون نے ایک اہم فرق کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی ''افلاطونی'' طاقت اور حقیقی طاقت، ''افلاطونی'' آزادی اور حقیقی آزادی کا فرق، یا دوسرے الفاظ میں نظریاتی آزادی اور مؤثر آزادی کے درمیان امتیاز ــــ وہ کہتا ہے کہ ووٹ کا حق ''بہت سی اجتماعی اور گروہی آزادیوں کا گلا گھونٹنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔'' عالمگیر بالغ رائے دہی نے مقامی مراعات اور گروہی آزادیوں کے نظام کی جگہ لے لی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب کسی کو ووٹ کا حق مل رہا ہو تو اسے ان مراعات اور آزادیوں کی کیا ضرورت ہے؟

''جمہور'' نہ تو صحیح معنوں میں اقتدار حاصل کر سکتا ہے نہ ہی اسے استعمال کر سکتا ہے۔ جب اقتدار کی روٹی کے ٹکڑے ان اکائیوں میں تقسیم ہوتے ہیں جن سے مل کر 'جمہور' بنتا ہے تو فرد کے حصے میں صرف ریزے ہی آتے ہیں۔ اتنے چھوٹے ریزے کہ نظر بھی نہ آئیں۔ لوگوں کو صرف نظری ''اختیار'' نہیں بلکہ سچ مچ کی طاقت درکار ہوتی ہے جو چاہے چھوٹے پیمانے پر ہی کیوں نہ ہو، کم از کم ان لوگوں کے مقابلے میں تحفظ فراہم کر سکے جو بڑے پیمانے پر اقتدار کے مالک ہیں۔

ایسی ٹھوس طاقت جو انسان کو احساس قوت بخشے نہ کہ صرف محض شماریاتی اور انتخابی اکثریتوں سے وابستہ ہو۔ لیکن اس کو حاصل کرنے کے لیے انھیں 'جمہور' سے باہر نکل کر افراد کی شکل اختیار کرنی پڑے گی اور اپنی ''رکاوٹی'' آزادیوں کی سختی سے حفاظت کرنی ہوگی۔ کوئی بھی جدید ریاست ایسی بے ترتیب صورت حال کو برداشت نہیں کرے گی چنانچہ ہم یہ غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آیا ہم جدید ریاست کو جیسی کہ وہ اب ہے اور جیسی وہ چند برسوں یا چند دہائیوں میں ہو جائے گی، قبول کر سکتے ہیں یا نہیں؟

یہ سمجھنا چنداں دشوار نہیں کہ یہ سوال کیوں نہیں پوچھا جاتا۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کی دہائیوں میں آزادی کے جو معانی تھے، آج ان معنوں میں مغربی یورپ میں بھی آزادی کی وہ وقعت نہیں رہی۔ اس کی ایک وجہ وہ سماجی تبدیلیاں ہیں جو حالیہ برسوں میں واقع ہوئی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا، صنعتی نظام نے لوگوں کا ایک ایسا نیا طبقہ پیدا کر دیا ہے جو اس کی ضروریات میں فٹ بیٹھ سکے۔ ایک 'اکھڑا ہوا بے ملک طبقہ'! حکمران طبقے کو جو آزادیاں عزیز ہیں وہ اس طبقے کے نزدیک اتنی ہی بے معنی ہیں جتنی یونانی شہری کی آزادی اس کے غلام کے لیے بے فائدہ تھی۔

اس کی سب سے واضح مثال برطانوی معاشرے میں ملتی ہے چونکہ صنعتی انقلاب نے یہیں سے جنم لیا تھا اس لیے اس کے منفی اثرات بھی سب سے زیادہ اس ملک کو بھگتنے پڑے۔ انیسویں صدی کے برطانوی وزیر اعظم ڈزرائیلی نے جب ''دو قوموں'' کی بات کی تھی تو وہ محض محاورے کا استعمال نہیں بلکہ زندگی کی ایک حقیقت کی نشاندہی کر رہا تھا۔ ان دونوں قوموں میں اس قدر بعد تھا کہ ان پر دو مختلف نسلوں کا دھوکہ ہو سکتا تھا۔ ایک تو حکمران طبقہ تھا جو واضح خصوصیات کا حامل تھا اور جسے اب بھی کبھی کبھی ''برطانوی کردار'' کا نمایندہ سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف مزدور یا محکوم طبقہ تھا جو انیسویں صدی میں گمنامی کا شکار تھا اور جس کی خصوصیات حکمران طبقے سے قطعاً مختلف تھیں۔ موجودہ صدی کے درمیانی برسوں میں ہونے والے واقعات نے دونوں طبقوں کا کردار الٹ کر رکھ دیا اور چونکہ ایسی عادتیں چند دہائیوں میں پیچھا نہیں چھوڑتیں، اس لیے یہ بھی ناگزیر ہے کہ جو طبقہ اب اقتدار پر قابض ہے، اس کی غلامانہ ذہنیت بدستور برقرار رہے۔

برطانیہ اور یورپ کے دوسرے ممالک میں (جہاں کے معاشروں میں بڑی بڑی زرعی اور قبل از صنعتی طبقات کی موجودگی نے دو طبقوں کے درمیان تفاوت کو اتنا نمایاں نہیں ہونے دیا تھا) عوام

کو حق رائے دہی ملنے اور مزدور یونینوں کو کامیابی کے بعد سیاسی اور سماجی طاقت ان لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے جن کے ہاں آزادی اور انفرادیت کی کوئی روایت موجود نہیں۔ فیکٹریوں کی مزدوری نے ان سے اور ان سے پہلے ان کے باپ دادا سے یہ اوصاف چھین لیے تھے اس لیے ان کے نزدیک یہ اوصاف ان کے سابقہ آقاؤں اور صنعتی استحصال کا لازمہ ہیں۔ ان حالات نے ایک اجتماعیت پرست ذہنیت کو جنم دیا ہے۔ آزادی کے انفرادی اشارے اجتماعی مفاد کے منافی سمجھے جانے لگے ہیں۔ مزدور یونینوں کی حصول قوت کی جدوجہد کے سامنے ہر وہ شخص ناقابل برداشت ہے جو قطار سے باہر نکلنے کی کوشش کرے۔

چنانچہ مغربی یورپ میں عوام یا ان کے رہنماؤں سے یہ توقع رکھنا حماقت ہوگی کہ وہ وقت کے رجحان کی مزاحمت کریں یا اپنی نو حاصل شدہ خوشحالی کو ان آزادیوں کی خاطر قربان کر دیں جو نہ تو کبھی انھیں نصیب ہوئیں نہ وہ اس کی قدر کر سکتے ہیں۔ یہ ہم کوئی اخلاقی حکم صادر نہیں کر رہے بلکہ ایک حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ایک آدمی غلامی اور برے سلوک کا شکار ہے، وقت کے ساتھ اسے اصلی آزادی تو نہیں (کہ اصلی آزادی کوئی تحفہ نہیں بلکہ ایک حالت ہے جس کے لیے انسان کا اہل ہونا ضروری ہے) البتہ سیاسی قوت کی کنجی ہاتھ لگ جاتی ہے۔ اب ہم کس طرح امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ اپنے ماضی سے چھٹکارا پالے گا۔

یہ خیال کہ عالمگیر بالغ رائے دہی کس طور فرد کی آزادی کی ضامن ہے، قطعاً بے بنیاد ہے۔ جمہوریت اور ''آزاد معاشرہ'' اتفاقاً اکٹھے ہو سکتے ہیں مگر وہ ایک دوسرے کے مترادف قطعاً نہیں ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ جو حکومت، محکوموں کی اکثریت کی رائے سے وجود میں آئی ہو وہ ایسی حکومت سے بہتر ہے جس میں یہ رائے شامل نہ ہو۔ لیکن اتنا کہ دینا کافی نہیں ہے بلکہ محض اس مفروضے پر مطمئن ہو کر بیٹھ جانا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

امریکہ کے بانی مبانی بزرگوں نے ریاست ہائے متحدہ کا دستور بناتے وقت یہ فرض نہیں کیا تھا۔ اٹھارویں صدی کے سیاسی فلسفیوں کے مغالطے دینی اعتبار سے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں، وہ کم از کم طاقت کے مزاج کو اپنے جانشینوں کی نسبت بہتر سمجھتے تھے۔ شمالی امریکہ میں جن لوگوں کے حصے میں یہ انوکھا کام آیا کہ ایک ''نئی دنیا'' میں ایک نئی طرز کا معاشرہ قائم کریں، وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بے اعتباری سیاسی میدان میں ایک اہم اور صحت مند کردار ادا کرتی ہے۔

جس بات سے وہ سب سے زیادہ گھبراتے تھے وہ تھی کسی ایک شعبے میں طاقت کا ارتکاز۔

فرانس اور روس کے انقلابیوں کے برخلاف جو بنیادی طور پر اپنے معاشروں کو الٹ کر رکھ دینا اور ایک قسم کی بے مہار طاقت کی جگہ دوسری قسم کی بے مہار طاقت کو رائج کرنا چاہتے تھے، امریکہ والے نہ صرف ''آمر کے غرور'' سے بدگمان تھے بلکہ ''عوام الناس کے غرور'' یا معاصر اصطلاح میں عوام کے اختیار پر بھی اعتبار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس بات کا ایک وجدانی شعور رکھتے تھے کہ روایتی اقتدار کے غائب ہونے کے بعد، آنے والے زمانے میں اولین ترجیح لادینی ریاست کی طاقت کی تحدید کو ہوگی۔ دستور اس طرز پر بنایا گیا تھا کہ طاقت کو ہر شعبے میں قابو میں رکھا جاسکے۔ یہ اقدام اس خیال کی بنیاد پر کیا گیا کہ طاقت کو جب بھی آزاد چھوڑا جائے، وہ ناجائز استعمال کی زد میں آتی ہے اور مستقبل کے شہریوں کو طاقت کے ناجائز استعمال سے محفوظ رکھنا دستور بنانے والوں کی ذمہ داری ہے۔

جو جمہوری نظام ''عوام کی حاکمیت'' کو (یا پارلیمانی اسمبلی میں عوام کے نمائندوں کو) ایک کھوٹی مطلق حیثیت دے دیتے ہیں، ان میں طاقت کے ناجائز استعمال سے حفاظت کی کوئی ضمانت باقی نہیں رہتی۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، اضافی اصول اور اقدار متغیر ترجیحات کے درجے سے تعلق رکھتی ہیں، اگر انھیں ''مطلق'' سمجھ لیا جائے اور ان میں سے کسی کو غیر مشروط ترجیح دی جانے لگے تو یہ ہمارے لیے ایک مہلک خطرہ بن جاتی ہیں۔ امریکی دستور قانون کے حوالے سے ''عوام کی حکومت'' کو محدود کرتا ہے بالکل اسی طرح جیسے وہ سربراہ مملکت اور کانگریس کی طاقت کو محدود کرتا ہے۔

اس سلسلے میں برطانیہ کی مثال بہت سے اہم نکتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ برطانوی نظام حکومت میں دو عوامل ایسے تھے جو روک تھام کرنے اور توازن برقرار رکھنے کا کام کرتے تھے۔ ایک تو شہنشاہ کا ویٹو کا مؤثر اختیار اور دوسرا موروثی ایوان دوم کا رکاوٹی کردار۔ ایسا لگتا ہے جیسے عالمگیر بالغ رائے دہی کے قیام اور ان عوامل کے خاتمے نے ملک میں بائیں بازو کے انتہا پسند حلقوں کے علاوہ اور ہر جگہ سیاسی مباحث کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ چنانچہ وہ قوم جس نے یورپ کے نامور ترین سیاسی مفکر پیدا کیے اور کروم ویل اور اس کے ساتھی شاہ کشوں کے تحت (لفظ شاہ کش (regicide) قتل کرنے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے چاہے یہ قتل کسی اصول کا ہو یا کسی شخص کا) پہلے جدید انقلاب کا علم بلند کیا، اب اپنے عوام کی سیاسی فلسفے سے عدم دلچسپی اور اپنی حکومتوں کی بدنام زمانہ افادیت پرستی کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ، رعایا کی آزادی کی اس فکر کی جگہ جسے باقی یورپ والے جنون گردانتے تھے، ایک بالکل مختلف چیز یعنی ''انصاف'' کے خبط نے لے لی ہے اور ''انصاف'' بھی بس کمیتی معنوں تک محدود ــــ اس خبط کا نتیجہ یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی مراعات یا امتیاز سے لوگوں کو چڑ سی ہوگئی ہے اور وہ اس حقیقت سے متعصبانہ انکار کرنے لگے ہیں کہ کچھ انسان دوسرے انسانوں سے فطرتاً اور از روئے تقدیر بہتر ہوتے ہیں۔ آزادی کی نگہبانی کی جگہ ہمسائے کی چوکیداری نے لے لی ہے کہ وہ کہیں ہم سے آگے نہ بڑھ جائے یا قطار سے باہر نہ نکل جائے۔ یہ امر بھی ناگزیر ہے اور اس کی ابتدا غلاموں کی کوٹھڑیوں سے ہوتی ہے۔ آزاد انسان انصاف کی فکر نہیں کرتے۔ وہ انسانوں کے درمیان عدم مساوات کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اگر غلاموں میں کوئی ایک اپنے حصے سے زیادہ لے بھاگے تو دوسرے تو بھوکے مرجائیں گے۔ انھیں زندہ رہنے کے لیے ایک دوسرے پر حسد کی نگاہ رکھنی ہے اور قطار میں صبر سے کھڑے رہنا ہے کہ اس نظام کا یہی تقاضا ہے۔

اس طرز فکر کا ایک اور ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ ایک معقول اصول کا (کہ حکومتوں کو اکثریت کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے اور مشترکہ بھلائی کے لیے کام کرنا چاہیے) غیر منطقی حد تک اطلاق کر دیا گیا ہے اور اس سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی ہے جس میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ رائے دہندگان کی ایک خیالی اکثریت نے (جو حقیقتاً اقلیت بھی ہوسکتی ہے) حکومت کو بلا روک ٹوک عمل کرنے کا اختیار دے دیا ہے۔

خیر، یہ بھی اتنی فکر کی بات نہیں تھی اگر جدید حکومتیں انھیں کاموں تک محدود رہتیں جو ایک صدی یا اس سے قبل تک حکومت کا معاملہ سمجھے جاتے تھے لیکن ہمارے دور میں تو حکومت ہر جگہ دخیل ہو چکی ہے، زندگی کے ہر پہلو پر اثر انداز ہونے لگی ہے اور اس نے یہ فرض کرتے ہوئے بہت سی نئی اور گوناگوں ذمہ داریاں سنبھال لی ہیں کہ انسان نہ تو اپنی حفاظت کر سکتے ہیں نہ اپنے ساتھیوں کی۔ مزید برآں حکومتوں نے ایک اساسی انقلابی کردار اختیار کرلیا ہے اور بزعم خود معاشرے کا ڈھانچہ تبدیل کرنے کی فوجدار بن بیٹھی ہیں۔

پہلے وقتوں میں یہ ممکن تھا کہ جو لوگ اپنے عہد کے برسر اقتدار نظریات کے مخالف ہوں وہ خاموشی سے ایک طرف پڑے رہیں یا بڑبڑاتے ہوئے اپنا رستہ لیں اور حکومت کے نظریات سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ اب تو وہ اس بات پر مجبور ہیں کہ جو کچھ ایک نام نہاد اکثریت کے نام پر کیا

جارہا ہے اسے نہ صرف قبول کریں بلکہ اس میں حصہ بھی لیں اور اپنی محنت کے ذریعے اسے آگے بڑھائیں، جیسے سزائے موت پانے والے اپنی قبر کھودنے پر مجبور کیے جارہے ہوں۔

تمام شہریوں کی اپنے معاشرے کے مقاصد اور سرگرمیوں میں جبری شرکت ہر اس سیاسی نظام کا لازمہ ہے جو ''عوام کی مرضی'' نافذ کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ چاہے اس پراسرار ''مرضی'' کا تعین کسی بھی طریقے سے کیا گیا ہو۔ یہ امر نہایت معنی خیز ہے کہ جبری بھرتی پہلی دفعہ فرانس کی انقلابی حکومت نے اس وقت شروع کی جب وہ پہلی ''عوامی جنگ'' لڑ رہی تھی۔ اس سے اگلے قدم پر ایک نیا اصول ایجاد ہوا: ''قومیت'' (جدید معنوں میں)، جس نے آگے چل کر انسانوں کو اپنی قوم کے نام پر ایسے جرائم کرنے کے لیے اکسایا کہ کوئی بدترین شخص بھی اپنی ذاتی مقصد برآری کے لیے ان کے ارتکاب سے جھجک جاتا۔

انسانوں کو اس طرح نہایت سلیقے سے مختلف قومی احاطوں میں منقسم اور محدود کرنا جدید زمانے کو بہت بھاتا ہے۔ آزاد نقل و حرکت کے زمانے سے لے کر آج کے دور تک اس تقسیم میں اضافہ ہوتا رہا ہے اور اب یہ حالت ہے کہ لوگ خود ساختہ سرحدوں کے اندر نہایت سختی سے مقید ہیں چاہے یہ قید دیواروں اور خاردار باڑ کی ہو یا پاسپورٹ کے سسٹم، کرنسی کی پابندیوں اور پروانۂ عمل (ورک پرمٹوں) کے نظام کی۔ یہ سب مل کر انھیں ایک خاص خطے سے باندھے رکھتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے پرانے وقتوں کے کمیرے اور غلام اپنے مالک کی قلمرو سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اس طرح سے قطار بندی کر کے کیمپوں میں تقسیم کرنے اور حد بندیاں قائم کرنے کے بعد انھیں سنبھالنا آسان ہو جاتا ہے اور ''قومی خود مختاری'' کا نظریہ جو بظاہر قانون کے ضابطوں کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، اس عمل میں مزید مدد دیتا ہے۔ جس کیمپ میں جو بھی شخص یا گروہ اقتدار پر قابض ہو جائے وہ من مانی کر سکتا ہے۔ جیسے 1976ء میں کمبوڈیا میں لاکھوں لوگوں کو بے دردی سے ذبح کر دیا گیا اور کوئی انگلی تک اُٹھانے والا نہ تھا۔ قوموں کی جمعیت میں نیکی کرنے والے کی کوئی جگہ نہیں۔ البتہ ظاہر پرست اور منافق خوب داد بٹورتے ہیں۔

جس معاشرے میں ہم مقید ہیں اس میں پوری طرح شمولیت پر مجبور کرنے والا ایک عنصر براہِ راست ٹیکس اور لگان کا وہ نظام بھی ہے جو چند سال پہلے تک ناقابل برداشت گردانا جاتا تھا۔ ٹیکس کا

نظام کو بہت عرصے سے ہم پر لاگو ہے لیکن یہ بھی اور بہت سی چیزوں کی طرح اس کی ایک مثال ہے کہ جب کسی بذاتہٖ ضروری چیز کو ایک حد سے زیادہ بڑھا دیا جائے تو وہ بالکل مختلف رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ماضی پر نظر ڈالیں تو ان بالواسطہ ٹیکسوں کو چھوڑ کر (جو ذاتی انتخاب کی گنجائش رکھتے تھے) جن کے ذریعے حکومتیں اپنا کاروبار چلاتی تھیں، اسلامی نظام زکوٰۃ ایک براہ راست محصول کی بہترین مثال پیش کرتا ہے جو غربا کی کفالت اور مساکین کی امداد کے لیے جو معاشرے کی ذمہ داری میں ہوتے ہیں' لگایا جاتا تھا۔ لیکن اس قسم کے روایتی لگان جو کہ مذہبی واجبات کا ایک حصہ تھے اور جدید انکم ٹیکس کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ مؤخرالذکر ایک طرف تو فرد، گروہ اور خاندان کی ذمہ داری ریاست کو منتقل کرنے کے لیے لگائے جاتے ہیں اور دوسری طرف معاشرے کے اندر رشتوں میں ردوبدل کرنے کے لیے۔

یہ سارا عمل جس سمت میں اشارہ کرتا ہے، اس پر غور کرنے سے اس کا نتیجہ واضح ہو جاتا ہے۔ تنوع کے وہ امکانات جو انفرادی پسند و ناپسند سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اقلیم جس میں انفرادی انتخاب کی آزادی میسر ہے، رفتہ رفتہ نہایت منظم طریقے سے محدود کیے جا رہے ہیں۔ جلد ہی ایک ایسا معاشرہ وجود میں آ جاتا ہے جس میں آدمی اپنی کمائی کا جو تھوڑا بہت حصہ آزادی سے خرچ کر سکتا ہے وہ محض ''جیب خرچ'' کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے جس سے چند آسائشیں خریدی جا سکتی ہیں، جبکہ ضروریات زندگی اور بہت سی چیزیں جنھیں پرانے وقتوں میں قطعاً ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا، فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی شخص کے معاشی طور پر خودمختار ہونے کا امکان ہی سرے سے ختم کر دیا جاتا ہے، چاہے وہ اس خودمختاری کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو۔ چنانچہ بچپن کی صورت حال کی طرف پلٹنے کا ایک عمل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ یعنی تحفظ تو فراہم ہے لیکن نہ تو انتخاب اور ذمہ داری میسر ہے نہ ہی اس برائی یا نیکی کے مظاہرے کا کوئی موقع جو ہماری کرداری خصوصیت ہے۔ اس طرح دنیا ایک ایسا سٹیج نہیں رہتی جس پر آ کر انسان یہ دکھا سکیں کہ ہم کیا ہیں بلکہ ایک محتاج خانہ بن جاتی ہے جہاں ان کی 'نگہداشت' کی جاتی ہے اور جہاں وہ 'نگہبانی' کے سائے تلے اس دن کا انتظار کرتے ہیں جب وہ تنہا اور بے لباس ہوں گے، سر پر سایہ نہیں ہوگا اور میزانِ عدل قائم ہوگی۔

ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہیں گے کہ اس قسم کا کوئی نہ کوئی نظام ایک پیچیدہ اور ترقی یافتہ صنعتی معاشرے کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے۔ ایک حد تک ان کی بات درست بھی ہے کہ آزادی اور صنعتیت ایک چھت تلے نہیں رہ سکتے۔ لیکن جو بات خاص اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ کس طرح چند دہائیوں کے اندر اندر صنعتی نظام کو اس طرح قبول کر لیا گیا ہے جیسے یہ بھی ہوا اور بارش کی طرح فطرت کا ایک مظہر ہے۔ لوگ یکسر فراموش کر چکے ہیں کہ پچھلی صدی میں بہادر آدمی اصول کی خاطر جیل جانے کو تیار ہو جاتے تھے مگر یہ ٹیکس ادا نہیں کرتے تھے اور آج جو معدودے چند لوگ اس ٹیکس سے جان چھڑانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں انھیں آزادی کے علمبردار نہیں بلکہ بدمعاش سمجھا جاتا ہے۔

یہ مان لیا گیا ہے کہ محصولات نہ صرف اقتصادی بلکہ سیاسی اور نظریاتی مقاصد کی خاطر بھی لگائے جانے چاہئیں، یعنی جو شخص اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ٹیکس میں ادا کر دیتا ہے وہ نہ صرف اپنے ملک کی ضروریات پوری کرنے میں حصہ لیتا ہے بلکہ ایک نظریے کی خاطر قربانی بھی دے رہا ہے چاہے وہ دل سے اس کا مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ یہ ایک بالکل نئی اور انوکھی صورت حال ہے۔ یہ بات عجیب بھی ہے اور خوفناک بھی کہ اس صورت حال پر کوئی اعتراض نہیں اٹھایا جاتا اور ہمیں ایک بار پھر یہ سوال کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ جانے کتنی چیزیں جو آج ہمیں ناقابل برداشت لگتی ہیں آنے والی چند دہائیوں میں یا اس سے بھی پہلے بے چون و چراں تسلیم کر لی جائیں گی۔

مغربی آزادی پسندوں کے چہیتے صدر نائیرے نے حال ہی میں ایک فقرہ کہا تھا: ''بہت سے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ لیکن ہم انھیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔'' یہ الفاظ تقریباً ہر جدید ریاست کے رہنماؤں کی ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ''فلاحی'' حکومتیں کیا کچھ اپنے فرائض میں شامل سمجھتی ہیں۔ وہ اس بات پر پختہ یقین رکھتی ہیں کہ انھیں ہر فرد کو تبدیلی کے عمل میں گھسیٹ لینے کا حق حاصل ہے اور اس ''ترقی'' سے الگ تھلگ رہنے والے یا تو پاگل ہیں یا خبیث!

ہم تھوڑے ہی عرصے میں اس زمانے سے بہت دور نکل آئے ہیں جب ''والڈن'' کے مصنف تھوریو نے لکھا تھا ''بہترین حکومت وہ ہے جو کم سے کم حکومت کرتی ہے۔'' اب تو مخالفت اور نفرت

مول لے کر پابندی لگانے اور قانون لاگو کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، جیسا کہ اُن مطلق العنان بادشاہتوں کے ایام میں ہوا کرتا تھا جو اپنے کیے کو چھپا کر رکھتی تھیں نہ اُس پر شرماتی تھیں۔ اب یہ سب کچھ سماجی اخلاق اور عوامی بھلائی کے نام پر آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ لادینیت کی دنیاوی اقلیم اتنی ہمہ گیر اور ساتھ ساتھ ایسی متکبر ہوگئی ہے کہ مذہبی انسان ایک کونے میں بیٹھ کر چین سے اپنے چھوٹے سے باغیچے کی دیکھ بھال کرنے ہی میں بہتری سمجھتا ہے۔ لیکن اب تقریباً ہر جگہ ہی یہ مشکل ہوگیا ہے اور بہت جلد ناممکن ہوجائے گا۔ ایک طرح سے یہ صورت حال قرون اولیٰ کے عیسائیوں کی یاد دلاتی ہے جو صرف یہ چاہتے تھے کہ انھیں نجات کی راہ پر چلنے کی آزادی ہو لیکن انھیں ان کی پوشیدہ پناہ گاہوں سے گھسیٹ کر نکالا اور شہید کردیا جاتا، اس لیے کہ ان کا وجود ہی وحشی رومتہ الکبریٰ کی آمریت کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا، حتیٰ کہ اور کوئی متبادل نہ پاکر انھوں نے اس معاشرے ہی کو تباہ کردیا جس نے انھیں مسل دینے کی کوشش کی تھی۔

آج ہم اس معجزے کے دوبارہ رونما ہونے کی کوئی امید نہیں رکھتے۔ اس ''آخری دور'' میں جب دنیا بھر کے ادیان کم از کم خارجی اعتبار سے بوڑھے اور اپنی اپنی وحی کے تاریخی سرچشموں سے دور ہوچکے ہیں، کسی بھی مذہب سے یہ توقع نہیں کہ وہ لادین ریاست کے دعووں اور اس کے وحشیانہ مقاصد کے سامنے ثابت قدم رہ سکے۔

کرۂ ارض پر کوئی چیز وقت کی گرفت سے آزاد نہیں ہے۔ چنانچہ یہ اَمر ناگزیر ہے کہ وحی الٰہی ایک مدت تک اس دنیا کی چیزوں اور انسانی اداروں میں مجسم رہنے کے بعد کہن سالی کے ایک عمل سے گزرتی ہے، لیکن آخر کو یہ ہے تو وحی الٰہی، اس لیے انسان ہر زمانے میں فرداً فرداً ان بوسیدہ ہڈیوں کے زندہ مغز تک پہنچ سکتا ہے اور اس ربط کے ذریعے اپنی دینی روایت کے اصلی زمانے میں گویا ایک نیا جنم لے سکتا ہے۔ یہ حقیقت بظاہر عالمگیر واقعات کی سٹیج پر کوئی خاص حیثیت نہیں رکھتی لیکن پھر بھی یہ ان معاشروں کے لیے ایک خطرہ ہے جنھوں نے خدا سے اور الوہی جہت سے منہ موڑ لیا ہے جو ان کے تمام تر دعووں کو نری بکواس ثابت کردیتا ہے اور یہ وجہ ان کے مذہب سے نفرت کرنے کو بہت کافی ہے۔ اشتراکی معاشرے میں تو اس نفرت کا اظہار مذہب پر علانیہ حملوں سے ہوتا ہے جبکہ باقی جگہوں پر یا تو مذہب کو صرف سماجی مقاصد کے لیے مسخ کرلیا جاتا ہے یا اس پر

دنیاوی پن کا روغن چڑھا دیا جاتا ہے۔ ان سب کا مقابلہ ایک ناقابل تسخیر حریف سے ہے۔

اشیا کی فطرت میں ایک قسم کا توازن، ایک قانون مکافات پایا جاتا ہے۔ چونکہ ہمارا عہد جمہور اور اجتماع کا عہد ہے اس لیے یہ فرد کا عہد بھی ہے۔ جب سب کچھ ڈگمگا جاتا ہے، پھسل جاتا ہے تو صرف یہ ایک مرد یا یہ ایک عورت یعنی ایک اقلیت قدم جما کر کھڑی رہ سکتی ہے۔ یہ مشورہ دینا تو فضول ہے کہ ایک 'اوسط' آدمی کو اکثریت کے خلاف اپنا مورچہ بنا لینا چاہیے اور ان کے فیصلے کے خلاف اپنے فیصلے پر ڈٹ جانا چاہیے، مگر پھر جب تک پردہ اٹھ نہ جائے یہ بتانا بھی تو مشکل ہے کہ اوسط آدمی کون ہے اور معیاری کون؟ یہ اشد ضرورت ہے جو مردوں کو لونڈوں سے جدا کرتی ہے۔

پھر بھی ایک عام آدمی تو یہ پوچھے ہی گا کہ آخر وہ اس قدر مشکل فیصلہ کرے ہی کیوں؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ نہیں تو پھر کون یہ فیصلہ کرے گا؟ پہلے وقتوں میں لوگ رہنمائی اور تعینات میں جیتے تھے۔ ہم نے اپنے لیے اور طرح کی زندگی پسند کی ہے ہم ''اپنے فیصلے خود کرنا'' اور ''اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا'' چاہتے ہیں، پرکھوں پرانی رسوم، غیر متغیر اخلاقیات، دانشمند مذہبی پیشواؤں، ایک دینی قالب اور ''آسمانی'' حکمرانوں کے سہارے کے بغیر اب ہم یہ شکایت کیسے کر سکتے ہیں کہ ہم پر جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے وہ بہت بوجھل ہے۔ اس لیے اس سوال پوچھنے والے سے یہ کہنا ہے کہ اور کوئی نہیں ہے جو یہ فیصلہ کرے، یہ تمہی کو کرنا ہے۔ یہی تو ہم چاہتے تھے کہ پرانے سلسلۂ مراتب اور عقائد سے آزادی ملے۔ ہماری دعا قبول ہوگئی ہے۔ یہ آدمی اب اپنے ہی رحم و کرم پر ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت جن باتوں کی قائل ہوتی ہے وہ سچے عقائد نہیں ہوتے بلکہ عموماً صرف ذہنی اور جذباتی عادتیں ہوتی ہیں جو رائے عامہ کے رخ پر تشکیل پاتی ہیں، وقت کے دھارے سے پار ان کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ یہ نہ سوچنے والوں کی سوچ اور نہ ماننے والوں کا ایمان ہوتی ہیں۔ گویا طوطے کی طرح کوئی کسی سنی ہوئی بات کی تکرار۔ لادینی ماحول کی مسخ کی ہوئی نسل اسی طوطے کی طرح وقت کے مقبول خیالات کو دہراتی رہتی ہے۔ جن لوگوں نے اپنی سوچ ابدی اور عالمگیر دانش سے منسلک کر لی ہے انھیں ان نام نہاد عقائد کی مخالفت کرنے کے لیے حد سے زیادہ فخر یا فکری نخوت کی ضرورت نہیں۔ اس سے جدید انسان کی صلاحیتوں کی تحقیر مراد نہیں، صرف اس کے

حالات میں ایک ایسے عنصر کی وضاحت کرنی مقصود ہے جس کی پہلے کوئی مثل نہیں ملتی۔ پچھلے زمانوں میں بسنے والے اپنے جیسے انسانوں سے وہ اس لحاظ سے مختلف ہے کہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک اور ہر روز صبح سے شام تک اس پر ہر طرف سے ان نظریات کی چاند ماری ہوتی رہتی ہے جو وقت کے اس دور میں مروج ہیں۔ پھر بھی پروپیگنڈے کے اس غل غپاڑے کو بے اثر کیا جاسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی کام میں محو ہو جانے سے ٹریفک کا شور مدھم پڑ جاتا ہے، بشرطیکہ جدید انسان ان دوسری آوازوں کو سنے اور ان عقائد پر توجہ دے جو اب بھی اس یاوہ گوئی کو خاموش کر دینے کی طاقت رکھتے ہیں۔

دور حاضر میں رائے عامہ کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ ہم ایک دوسرے کی کمر کھجانے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ یعنی معاشرے کے فائدے کے لیے۔ اتنا تو بندر بھی ایک دوسرے کے لیے کر دیتے ہیں۔ جب کوئی مسلمان یہ کہتا ہے کہ ہم عبادت کے لیے پیدا ہوئے ہیں، کام کے لیے نہیں تو وہ صرف انسان اور حیوان کے درمیان حد امتیاز کھینچ رہا ہے اور اولین فرضِ انسانی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ روایتی فکر میں یہ نظریہ یہی حیثیت رکھتا ہے کہ حیوان وقت میں مقید ہے لیکن انسان اس قید سے آزاد نہیں ہے۔

آج کے دور میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کے پاس بصارت تو ہے، علم نہیں۔ وہ وقت کے رجحان کے خلاف نبرد آزما ہو سکتے ہیں اگر وہ تذبذب کا شکار نہ ہوں اور انھیں خود پر یقین ہو۔ جدید زمانے کی سطحی 'عقل سلیم' سے ڈر کر اور اس کی انسانیت پرست ڈینگوں سے مرعوب ہو کر وہ اپنے محرکات اور اپنی دانش کے بارے میں خود بھی پوری طرح پر اعتماد نہیں ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ انسانیت پرستی گھٹیا ترین نیکی ہے۔ آزادی پسند اور انسانیت پرست نظریات بگھارنے میں اپنے پلے سے کچھ نہیں جاتا، کوئی قربانیاں نہیں دینی پڑتیں اور سماجی مقبولیت مفت میں ہاتھ آتی ہے۔ ان آرا کو عملی جامہ پہنانے کی صورت یہ ہے کہ ریاست کو غربا، مساکین اور مصیبت زدگان کی ذمہ داری سنبھالنے پر آمادہ کیا جائے۔ جب یہ کام سرانجام پا جاتا ہے تو پھر جب کوئی رشتہ دار یا دوست مدد کے لیے اس نیک آدمی کے پاس آتا ہے تو وہ نہایت بیزار ہوتا ہے، آخر حکومت نے ان کی ذمہ داری سنبھال لی ہے، ایسے لوگوں کو متعلقہ حکام کے پاس جانا چاہیے اور ضروری کاغذات پر

کر کے مدد حاصل کرنی چاہیے۔ اب وقت ہے کہ ان لوگوں کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا جائے جو یہ کہتے ہیں کہ جو شخص بھی ''سماجی ذمہ داری'' کے مقبول عام نظریے کی مخالفت کرتا ہے وہ اگر ہٹلری رجحانات نہیں ظاہر کر رہا تو کم از کم اپنے ہمسائے کے حقوق سے بے اعتنائی ضرور برت رہا ہے۔ ییٹس کے ذہن میں ایسی ہی کوئی بات ہوگی جب اس نے یہ مصرع لکھا تھا۔

بہترین لوگ یقین سے محروم ہیں جبکہ بدترین لوگ پرجوش وارفتگی سے بھرپور ہیں۔

اس لیے یہ بہت اہم ہے کہ عہد جدید کی انحرافی حیثیت کو آشکار کیا جائے اور اس کے جھوٹے دعووں کا پول کھول دیا جائے اور اس قسم کے متذبذب لوگوں کو باور کرایا جائے کہ خرابی ان میں نہیں ان کی دنیا میں ہے۔ اس بیمار دنیا میں صحت کا عطیہ رکھنے والوں کا فرض ہے کہ اپنی ذمہ داریاں محسوس کریں۔ اس کا طریقہ یہ نہیں کہ وہ پیشہ ور اصلاح کاروں کے ساتھ مل کر کام کرنے دوڑ پڑیں بلکہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو جانیں، اپنے جواز وجود کو سمجھیں اور ایسا وقار اور دیانت اختیار کریں جو واقعات کے مقابلے میں کھری ثابت ہو۔ ہمیں عمل کے لیے مواقع تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، چاہے ہم پسند کریں یا نہ کریں، وہ ہمیں ملتے رہتے ہیں اور ان کا ملنا اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ وہ ہمارے ہی لیے رونما ہوئے ہیں۔

چونکہ جدید دور نے انسانی دنیا کے مغربی گوشے میں جنم لیا اس لیے اسی علاقے میں فرد واحد کو مضبوطی سے جمے رہنا اور اپنے دور کے نظریات کو زیر بحث لانا ہے۔ باقی دنیا کے لیے یہ نظریات ابھی اتنے نئے اور دلچسپ ہیں کہ لوگوں کو ان پر شک یا اعتراض کرنے کا ہوش نہیں آیا اور پھر ان میں کامیابی کی بو بھی رچی ہوئی ہے۔ ان کے پاس بڑے بڑے بم ہیں اور ڈیم اور بند ہیں اور ان بندوں کو توڑنے والے آلات ہیں۔ لیکن ہمارے لیے تو یہ پرانی چیزیں ہو چکی ہیں اور ہمیں پیش قدمی اور ترقی کے توہمات سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے جس طرح ہم بعض ایسے امراض سے مامون ہو چکے ہیں جو دنیا کے دوسرے علاقوں میں پہلے پہل پوری پوری آبادی کی تباہی کا سبب بن جاتے تھے۔

مزید برآں، مغربی آدمی ہمت دکھانے اور خطرات مول لینے کے قابل ہے۔ اس کے پاس مادی اعتبار سے تمام تر مراعات اور سہولتیں موجود ہیں، وہ محفوظ اور آرام دہ حالت میں ہے۔ اس کے ہاں کے غریب، ایشیا اور افریقہ کے حساب سے امیر کہلا سکتے ہیں اور اس کا پیٹ اتنی باقاعدگی

اور وافر مقدار میں بھرا جاتا ہے کہ وہ غذا کے لیے شکر گذار ہونا بھی بھول جاتا ہے۔ اس کے بہت کم بچے شیر خوارگی میں موت کا شکار ہوتے ہیں اور وہ خود بھی اتنا عرصہ جینے کی توقع رکھتا ہے کہ آخر کار اپنے گناہوں پر پچھتا سکے۔ اس کی تشویش کی وجہ ضروریات زندگی نہیں بلکہ آسائش اور تفریحات ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ''جتنا شرف اتنے فرائض'' اس لیے کہ اس شخص کے بہترین دوست بھی اسے شرف یافتہ یا عالی مرتبت ماننے پر تیار نہیں ہوں گے لیکن کم از کم اسے اپنی غیر معمولی اچھی قسمت کو تو تسلیم کرنا چاہیے اور ان واجبات اور فرائض کو بھی جو خوش قسمتی کے ساتھ ساتھ لاگو ہو جاتے ہیں۔ اس کے پاس تو اس تشویش اور تفکرات کی کوئی وجہ نہیں جو انسان کے دماغ کو بقا کے مسئلے میں الجھائے رکھتے ہیں، وہ اس مخصوص انسانی استعداد کی جو اسے عطا کی گئی ہے، نشوونما دینے اور اسے استعمال کرنے کے لیے آزاد ہے اور یکسوئی کے ساتھ تلاشِ حق کر سکتا ہے۔

مگر خوش قسمتی صرف مادی ضروریات کے پورا ہونے کی سطح تک محدود نہیں ہے۔ اس سے کہیں زیادہ آفاقی اور عالمگیر عنایت اور رعایت ایک اور ہے جس سے ہم سب اپنی دنیاوی صورت حال سے قطع نظر بہرہ مند ہوتے ہیں اور اس سے تمام انسانی حمد اور تشکر کی کیفیات صادر ہوتی ہیں۔ ہمیں انسان پیدا کیا گیا ہے۔ جنگل کے یا باڑے کے جانور بنا کر نہیں پیدا کیا گیا۔ ایسے مرد و زن کی صورت میں تخلیق کیا گیا ہے جو حیوانی سطح پر باقی اور زندہ رہنے کی تگ و دو سے پرے بھی جھانک سکتے ہیں اور جو آتے جاتے وقتی حوادث کے اندر اور ان سے ماورا کو جاننے کے قابل ہیں۔ وہ ذات مطلق جو اعلیٰ بھی ہے اور ہمارے وجود کی گہرائی میں موجود بھی۔ اگر زاویہ نگاہ صحیح ہو تو اس دھرتی کی کوئی مثبت شے ایسی نہیں جو وسیلۂ نجات، ذریعہ برکت و رحمت اور حقیقت کا عکس نہ ہو۔ آزادی اور نجاتِ اخروی کے وسائل ہر جا، ہر طرف میسر ہیں، انبیا اور رُسل کی ضو سے روشن، جنھوں نے ہمیں یہ بتایا کہ ہم کیا کریں اور کس سمت میں نگاہ کریں۔

ہندو کہتے ہیں کہ انسانی مرتبہ وجود ''دشوار گذار'' ہے۔ عالم جمادات، حیوانات اور نباتات کے مقابلے میں یہ بے شمار اور لاتعداد عنایات اور مراعات کا حامل ہے۔ عالم انسانی میں پیدا ہونے کے پہلے لمحے سے درِ رحمت ہمارے لیے وا ہو جاتا ہے۔ استعداد ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہے۔ ہم نے جدید دور کے انسانی معاشروں کے بارے میں اب تک جو کچھ کیا ہے اسے چند الفاظ میں یوں سمیٹا جا سکتا ہے۔ جو چیز بھی اس استعداد کے مرجھانے کا سبب ہے یا اس کو مانع ہے وہ ملعون اور نابود

کر دیے جانے کے قابل ہے۔ ہر وہ شے جو اسے پروان چڑھاتی ہے مبارک ہے اور اس کو سارے حقوق ملنا چاہئیں۔

جس صورت حال میں ہمیں قدرت نے رکھا ہوا ہے، اس میں اگرچہ ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ اپنے اور اپنے ساتھیوں، ہمسایوں کے روزمرہ کے مسائل پر طبعی تشویش محسوس کریں تاہم یہ تشویش اپنی خوش قسمتی کے لیے حمد و تشکر کے اس پس منظر میں وجود رکھتی ہے جسے عارضی مشکلات اور مصائب کبھی پوری طرح دھندلا سکتے۔ احساسِ تناسب انسان کی ذمہ داری ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو انسانوں کی استعداد کے اندر ہے۔ وقت اور ورائے وقت ابدیت میں کوئی مشترک پیمانہ نہیں اور اس دنیاوی زندگی کی دھوپ چھاؤں اور اس مسرت میں کوئی موازنہ نہیں جس کے جوہر سے حقیقت کا تانا بانا تیار ہوا ہے۔ سماجی اقلیم اور اس کو درپیش خطرات کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے اس سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھنا چاہیے اور جتنی فکر یا تشویش اس کے لیے مناسب ہے صرف اتنی ہی فکر کرنا چاہیے اور بس۔

انسان یا تو سب کچھ ہے یا کچھ بھی نہیں۔ علم الٰہی کا ایک منفرد نمونہ یا کروڑوں ذراتِ خاک میں سے ایک ذرہ ناچیز۔ دین کے دائرہ سے باہر یا ان حقائق سے باہر جو وحی کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ نازی یا کمیونسٹ نقطہ نظر یا کسی بھی ایسے نظریاتی مکتبِ فکر کا خیال جو فرد کو اجتماع کا مکمل غلام بنا دیتا ہے، ایک اعتبار سے قرینِ عقل ہے، جب اس کا مقابلہ ان لوگوں کی مریل جذباتیت سے کیا جائے جو یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی زندگیاں یا انسانی احساسات معاصر لادینیت کے سیاق و سباق میں کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب تلوار بے نیام کرنے کی نوبت آ ہی جائے تو پھر ایسے انسانیت پرست شخص پر رحم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں جو یہ سمجھتا ہو کہ دین کو خارج کر کے بھی انسانیت کو عزیز رکھا جا سکتا ہے۔ ایک اعتبار سے یہی وہ منصف یا جج ہے جو فیصلہ دے رہا ہے اور ہماری دنیا کے لینن، ہٹلر، سٹالن اور ماؤ یا دیگر ششدر دہقان اور بورژوا بالشتیے جنھیں یوٹوپیا کا نشہ چڑھا ہوا ہے صرف اس فیصلے کو نافذ کر رہے ہیں۔

گھٹائیں اُمڈ رہی ہیں۔ طوفان کی گرج بڑھ رہی ہے اور ہم اپنے ریت کے قلعے بنانے میں مگن ہیں کیونکہ یہ قلعے اپنی چھوٹی سطح پر اچھے لگتے ہیں اور بعضے ان میں دلکش بھی ہیں اور چونکہ یہ ایک اور مقام کی اوضاع کا عکس پیش کرتے ہیں، ایک ایسی اقلیم کا عکس جو ان سے کہیں زیادہ مستقل

اور پائیدار ہے۔ اور جو اِن گریزاں اور لرزتے صناعیوں میں عکس ریز ہے۔ مگر ہر مرد اور عورت جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے اِس میں اِس مٹتی ہوئی دنیا کے اندر چند روزہ زندگی گزارنے والی مخلوق ہونے کے علاوہ اور اس سے بے انتہا زیادہ ہونے اور بننے کے پورے امکانات ہوتے ہیں جیسے ایک بیج میں بالقوہ ایک بڑا تناور درخت چھپا ہوتا ہے۔ ہمیں اپنا امکان، حقیقت میں بدلنا ہوگا وگرنہ سراسر ناکامی ہمارا مقدر ہے۔ یہی ہماری صورت حال کی کھری، صاف اور کڑی تصویر ہے۔

باب پنجم

آدمی- خلیفۃ اللہ

ایک بار کا ذکر ہے (کوئی بہت پرانی بات نہیں) کہ ایک یورپین گداگر گھومتا پھرتا بلیدا کے ایک عرب قہوہ خانے میں جانکلا۔ وہاں بیٹھے ہوئے مسلمانوں میں سے ایک نے اسے ایک سکہ دے دیا۔ دوسرے نے پوچھا ''تمہارے خیال میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسی خیرات کی کوئی اہمیت ہے۔'' خیرات دینے والے نے جواب دیا'' کچھ پتہ نہیں کہ ایک مسکین فقیر کے پردے میں کون چھپا ہوا۔''

اس قسم کی دانش مندی مسلمانوں میں عام طور پر پائی جاتی ہے، اس لیے کہ ان کی ذہنی تربیت میں یہ اعتقاد شامل ہے کہ یہ خدا دوست لوگ جس رنگ میں چاہیں آپ کے درمیان گھومتے رہتے ہیں، کبھی چیتھڑوں میں، کبھی امیرانہ شان سے اور ان میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ، اللہ کی منشا و مرضی سے، کسی صورتِ حال کو تبدیل کردیں یا کسی کی زندگی کا طور طریقہ بدل ڈالیں۔ ہر شخص کے اندر کا بھید صرف خدا کو معلوم ہے اور ہر شخص کا احترام کرنا چاہیے نہ صرف اس لیے کہ بحیثیت انسان وہ احترام کے لائق ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ہم نہیں جانتے وہ دراصل کیا ہے، وہ خدا کے بہت قریب بھی ہوسکتا ہے۔ کیا جانیے کہ بظاہر ایک عام سا آدمی اپنی آستین میں یدِ بیضا چھپائے بیٹھا ہو!

بسا اوقات 'دستِ قدرت' کے حامل یہ لوگ نہایت مسکینی سے ہاتھ جوڑے نظر آتے ہیں اور اپنی اس صلاحیت کو صرف لوگوں کو مشکل سے نکالنے اور شفا بخشی کے لیے ہی استعمال کرتے ہیں۔ ایک مرید بے صفا کا قصہ یوں بیان ہوا ہے کہ وہ ہر روز اپنے مرشد سے اسم اعظم سکھانے کا مطالبہ کیا کرتا تھا۔ اسم اعظم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا علم اولیا اللہ میں سے صرف خاص خاص لوگوں کو ہوتا ہے اور اس اسم اعظم میں ایک غیر معمولی قوت اور تاثیر ہوتی ہے۔ روز روز کے تقاضوں سے تنگ آ کر مرشد نے اس مرید سے کہا کہ شہر پناہ کے دروازے پر چلے جاؤ اور دن بھر جو دیکھو اسے مجھ سے آ کر بیان کرو۔ وہاں بتانے کو کیا رکھا تھا۔ مرید نے آ کر کہا، ''لوگ آتے جاتے رہے۔ ایک بوڑھا اپنا گدھا ہانکتا ہوا آیا۔ گدھے پر ایندھن کی لکڑیاں لدی تھیں۔ اس کے عقب میں ایک سپاہی

تھا۔ اس نے بوڑھے کو مار پیٹ کر اس کا گدھا بھی چھین لیا اور لکڑیاں بھی ہتھیا لیں۔'' مرشد نے پوچھا کہ اگر تم اس بوڑھے کی جگہ ہوتے اور اسم اعظم کا راز جانتے تو اس سپاہی سے کیا سلوک کرتے؟ ''میں تو یقیناً اس کو موت کی بددعا دیتا''۔ ''خوب''، مرشد نے جواب دیا، ''تو پھر سن لو کہ یہ بوڑھا لکڑہارا جس نے سپاہی کی ظلم و زیادتی پر اُف تک نہ کی وہی شخص ہے جس نے بہت زمانہ ہوا مجھے اسم اعظم سکھایا تھا!''

یاد رہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ یہ برق قدرت ان خدا دوست لوگوں، اللہ کے ان محبوب بندوں کے قابو میں ہو جن کے لیے یہ نسیم بہار کی مانند ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں اس نکتے کے بیان کے لیے ایک اور قصہ سنایا جاتا ہے کہ لوگ جان لیں کہ یہ عظیم لوگ جو ہمارے درمیان گھلے ملے رہتے ہیں ان میں قوت اور رحمت دونوں چھپی ہوتی ہیں۔

گیارھویں صدی کے ایرانی ولی اللہ ابوسعید، ایک زمانے میں بہت ٹھاٹھ اور آرام و آسائش سے رہتے تھے۔ روز ضیافتیں ہوا کرتی تھیں اور موسیقی اور رقص کا چلن تھا۔ جو لوگ اہل روحانیت کو صرف مروجہ لبادۂ فقر ہی میں شناخت کرنے کے عادی تھے ان کے لیے بہت مشکل تھا کہ وہ شیخ ابوسعید کے اس ظاہری ٹھاٹھ باٹھ میں چھپی ہوئی ان کی روحانیت کا اندازہ کر سکیں۔ سو وہ طرح طرح کی باتیں بنایا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک نے جو کسی جگہ کا رئیس تھا ابوسعید سے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا اور خاصی درشتی سے پیش آیا۔ اس اللہ والے نے جواب میں نہ کچھ کہا نہ کچھ کیا لیکن اس امیر آدمی کے وفادار شکاری کتے یکا یک پاگل ہو کر اپنے مالک پر ٹوٹ پڑے اور اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ اللہ کی غیرت کو للکارنا نہیں چاہیے۔ جو لوگ اللہ والوں کو مضحکہ اُڑاتے ہیں وہ عالم طبعی میں ابتری اور بدنظمی کا ایسا بھنور پیدا کر دیتے ہیں جو ان کو بھی ڈبو کر چھوڑتا ہے۔

اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ، معاشرے میں عام لوگوں کے درمیان ان افراد کی موجودگی سے اچھی طرح آگاہ تھے جو باقی لوگوں جیسا نظر آنے کے باوجود دراصل اپنے اندر ایک اور دنیا کی مہک لیے ہوتے ہیں۔ عیسائی اور یہودی قصوں میں ایسے پراسرار اجنبیوں کا ذکر ملتا ہے جو اپنے روحانی مرتبے کو چھپائے عام انسانوں کے درمیان گھومتے رہتے تھے۔ اسی طرح قبل از مسیح کی یوروپی داستانوں میں چاہے وہ یونانی ہوں یا المانی، دیوتاؤں کے ایسے قصے ملتے ہیں جب وہ غریب مسافر کے روپ میں بادشاہ کے محل یا کسان کی جھونپڑی میں آنمودار ہوئے اور کوئی خوش خبری دینے، تنبیہ

کرنے، کسی مسئلے کا حل بتانے یا خزانے کا پتہ دینے کے بعد غائب ہوگئے۔ اس قسم کے واقعات اور کردار ہندو اور بدھ مت اور ہر قدیم معاشرے کی دیو مالا میں پائے جاتے ہیں۔ وہ 'جہاں گرد' ہر جگہ موجود ہے۔

لیکن جن دنیاؤں میں اللہ کے یہ بندے ظاہر ہوتے تھے وہ (جدید لوگوں کے خیال میں) انسان کو بہت زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ ان کے نزدیک انسان اپنی مختصر عارضی زندگی سے آگے ایک مافوق الفطرت مستقبل کا مالک ہے اور اپنے افعال اور اعمال کے نتیجے میں، جن کی گونج بہت دور تک جاتی ہے، سزا یا جزا کا مستحق ہے۔ اس لیے وہ انسانی ذمہ داری کا ایسا تصور پیش کرتی تھیں جو عام انسان کے سامنے بھی بالکل واضح ہو۔ جو بھی کچھ یہ عام آدمی کرتا ہے، وہ اس تک محدود نہیں بلکہ اس کی اہمیت کون و مکان کی سرحدوں سے پار عرش کے کنگوروں تک پھیلی ہے اور اس کے نتیجے میں اس پر اللہ کی نعمت یا عذاب نازل ہوسکتا ہے۔ انسانی دنیا کو بہت سے مقامات پر مافوق الفطری یا طلسماتی قوتیں چھوتی تھیں، یہ ایک وسیع بے کراں دنیا تھی اور صحیح معنوں میں پرجلال اور حیرت افروز تھی۔

رعب اور احترام کا بڑا قریبی تعلق ہے۔ جدید دنیا کی نری سماجی اخلاقیات انسانی گروہوں کے عملی مفاد اور اس نظریے پر قائم ہے کہ بڑے پیمانے پر ہونے والی لاقانونیت یا غنڈہ گردی معاشرے کے استحکام کے لیے مضر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس اخلاقیات میں رعب یا جلال کا عنصر بالکل غائب ہے۔ اس لیے بالآخر انسان کا بحیثیت انسان احترام بھی ختم ہوگیا ہے۔ پہلے بس نازی احترام انسانیت کا کھوکھلا نعرہ بلند کرتے تھے اور اب اشتراکی حکومتیں بھی یہی کام کر رہی ہیں تاکہ اپنے قبیح افعال کا جواز پیش کرسکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہمارے ذہنوں سے دینی نقطۂ نظر کے نقش پوری طرح مٹے نہیں ہیں اور ہمارے زمانے کے بدترین لادین معاشرے بھی اس کی پکڑ سے نکل نہیں سکے۔ خدا کی ''موت'' کو ابھی کچھ ہی عرصہ گذرا ہے!

انسان کے احترام کا نظریہ اگر باقی بھی ہے تو صرف سماجی درجے تک۔ یہ لفظ بھی اب اتنا مؤثر نہیں رہا اور اس میں سے جلال اور ہیبت کا عنصر تو بالکل غائب ہوگیا ہے۔ اب اسے ایک تضحیک کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اور اس مدعا اور مفہوم سے کاٹ کر جو کبھی اسے حاصل تھا یعنی اس میں سے خوف کا وہ عنصر نکل گیا ہے جو کبھی اس کی آبیاری کرتا تھا، ان جانے، ان دیکھے کا خوف، اس وسیع سرزمین وجود کا خوف جو ایک عام چہرے کی اوٹ میں دائرہ در دائرہ پھیلی ہوئی

ہے۔ جیسے جیسے آپ کی نظر میں ایک شخص کا احترام کم ہوتا جائے گا، اس کے کردار کے بارے میں بھی آپ کی رائے خراب ہوتی چلی جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب کسی فرد کے بارے میں جو رائے قائم کی جائے گی وہ صرف کسی خاص فعل یا عمل کی روشنی میں مرتب ہوگی۔ یہ وہ سمت ہے جس میں احترام آدمی کا پودا جڑ پکڑ ہی نہیں سکتا۔

جب انسان کو صرف سماجی سیاق میں دیکھا جانے لگے تو فیصلے اور رائے کی حدود اگر فراموش نہیں تو کم از کم الٹ پلٹ ضرور ہو جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 'فرعون کے گناہ' سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔ یعنی فانی انسان کی مسند داور حقیقی پر بیٹھنے کی کوشش! کوئی انسان دوسرے انسان کی قدر و قیمت متعین نہیں کر سکتا کہ ایسا کرنے کے لیے ایسی اقدار اور پیمانوں کا علم ہونا ضروری ہے جو سماجی اقلیم سے بے انتہا بلند ہیں اور اس کا اظہار صرف سکوت میں ہو سکتا ہے۔ احترام اس کی جڑیں اس علم میں پیوست ہیں جو سکوت میں جذب ہو کر ہر اس لفظ کو مٹا دیتا ہے جو ہم ادا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔

اگر یہی معاملے کا آغاز و انجام ہوتا تو یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی کہ انسانی رائے اور فیصلے کی حدود کہاں ختم ہوتی ہیں۔ ہمارے گرد سکوت کا حصار ہوتا اور ہر سو سکوت کی عمل داری رہتی لیکن چونکہ ہم آوازیں رکھتے ہیں اس لیے انھیں استعمال بھی کرنا چاہیے۔ اپنی زندگی میں جگہ جگہ ہمیں دوسرے انسانوں کے بارے میں رائے قائم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ رائے کسی کام کے سلسلے میں ان کی قابلیت، ہمارے بارے میں ان کے ذاتی رویے یا ان کے مستقبل کے کردار کے بارے میں ہو سکتی ہے۔ ہمیں ان کو وقتی یا فوری سیاق میں رکھ کر دیکھنا پڑتا ہے لیکن ہم اکثر اس محدود یا وقتی رائے کو مطلق رائے بنانے پر مائل ہو جاتے ہیں اور یہ سوچ لیتے ہیں کہ یہ وقتی سیاق جس میں ہم نے رائے قائم کی ہے مستقل اہمیت کا حامل ہے۔ اس معاملے میں اکثر لوگ 'فرعون کے گناہ' کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم انسانی جذبۂ محبت کو اپنی رائے پر فوقیت دینے سے انکار کرتے ہیں تو ہم سراسر غلطی پر ہیں۔ سوائے اس صورت کے جب محبت قوت فیصلہ کو ہی معطل کر دے باقی صورتوں میں اسے عقل کے فیصلے پر برتری حاصل ہوتی ہے۔ ایسی اندھی محبت جو کسی کے کردار کے حقائق سے بے خبر ہو، احترام اور تقدم کی مستحق ہے۔ وہ بیوقوف الھڑ لڑکی جو کسی مجرم کو چاہتی ہو یا وہ احمق شخص جو کسی فاحشہ سے اسے باعصمت جان کر پیار کرتا ہو، اپنی ذات کی گہرائیوں میں ایک سچے جذبے کا اظہار کر رہے

ہیں اور حقیقتاً اتنے بے خبر نہیں جتنا انھیں سمجھا جاتا ہے۔ کئی دفعہ شہوت (مروجہ معنوں میں) ایسے دروا کر دیتی ہے جو متین عقل وانہیں کر سکتی اور مختصر سے وقت کے لیے (کہ یہی اختصار تو اس کا اصل گناہ ہے)، ایک ازلی، ابدی سچ کو عیاں کر دیتی ہے۔ رابعہ بصری کا قصہ یاد کیجیے جب ایک ہوس پرست شخص نے شب باشی کی نیت سے اِن کا پیچھا کیا اور وہ اِسے رجھا کر اپنے صوفی ساتھیوں کی خانقاہ تک لے گئیں اور ان سے کہا: ''یہ ایک سچا عاشق ہے۔ اس کے لیے عشق حقیقی کی مَے انڈیلو۔''

جو فعل یا جذبہ بھی بیگانگی میں وحدت کا پیغام لاتا ہے اور اندھیرے میں تفہیم، اخوت اور توجہ کی کرن روشن کرتا ہے وہ اپنی جگہ شرف کے قابل ہے۔ جذبۂ محبت چاہے کسی احمقانہ یا غلط رائے پر ہی کیوں نہ قائم ہو ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ محبت کرنے والا چاہے کسی غلط مقصد کے لیے ہی سہی زبان تو صحیح بول رہا ہے۔ کئی دفعہ یہی کافی ہوتا ہے کہ کوئی صحیح زبان بول رہا ہے، ہمیں اس کے استدلال سے غرض نہیں رکھنی چاہیے۔

اخلاقی نظریات کو انسان کی جانچ کی بنیاد بنانا تبھی ممکن ہے جب یہ نظریات یا تو مافوق الفطری سانچے پر مبنی ہوں (اس صورت میں یہ کبھی نہ کبھی معاشرے کے مفاد سے ضرور ٹکراتے ہیں) یا پھر سماجی تقاضوں پر۔ اس دوسری صورت میں یہ ہوتا ہے کہ صرف سماجی سیاق میں انسان کے بارے میں جو رائے قائم کی جاتی ہے اسے حتمی سمجھ لیا جاتا ہے۔ جو گروہ بھی افراد کو خوراک اور پناہ دیتا ہے اسے اپنے تحفظ کے لیے کچھ حقوق بھی حاصل ہوتے ہیں اور ان حقوق میں اس فرد کو ختم کرنے کا حق بھی شامل ہے جو گروہ کے مفاد اور تحفظ کے خلاف عمل کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک خاص سیاق وسباق میں کیا جانے والا فیصلہ ہے اور صرف اسی سے متعلق ہے۔ جو فیصلہ ایک جگہ درست ہو سکتا ہے وہ دوسرے حالات اور دوسری جگہ یا کسی اور وقت میں غلط بھی ہو سکتا ہے اور اسے انسان کے بارے میں حتمی فیصلہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ہم حد سے اس وقت گزرتے ہیں جب کسی شخص کو بدلنے، اس کی اصلاح کرنے (یا کایا کلپ کرنے) اور اسے اپنے مخصوص سماجی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔

معاشرے کو اپنے دفاع کی خاطر بہت سی سزائیں دینے کا حق حاصل ہے لیکن یہ حق اسے کسی طور حاصل نہیں ہے کہ انسان کو اس کے بنیادی وقار سے محروم کر دے۔ اسے اپنی فطرت اور اپنے جوہر میں ادنیٰ سمجھنے اور اسے ''ٹھیک'' کرنے کا ٹھیکہ لے لے۔ جس زمانے میں ہم رہتے ہیں اس میں نرم دلی پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور اذیت پہنچانے کو گھناؤنا فعل سمجھا جاتا ہے۔ یہ جذبات اپنی جگہ

قابل قدر ہیں لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے کے جوش میں ہم کچھ اور اہم ترین باتوں کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں۔ کسی بالغ شخص کو ایک ستھرے لیکن بدنما قید خانے میں بند کر دینا جہاں اس سے ایک کج رو بچے جیسا سلوک کیا جاتا ہو کچھ کم گھناؤنی اور توہین آمیز بات نہیں۔ مثالی جیل کے مقابلے میں کوڑا یقیناً زیادہ ظالمانہ چیز ہے لیکن کوڑا کھانے والا شخص صحت یاب ہو جاتا ہے۔ جو شخص ہر روز ذلت اور اپنی آدمیت سے محرومی کا نشانہ بنتا ہے وہ شاید کبھی صحت یاب نہ ہو سکے۔

معاشرے کو اپنے دشمنوں سے حفاظت کا جو حق حاصل ہے اس میں یہ ذمہ داری بھی شامل ہے کہ وہ ان دشمنوں کو برابر کا انسان جانے۔ جمیکا کا ایک مصنف جون ہی آرن نو آبادکاری نظام کے سلسلے میں بڑے پتے کی بات لکھتا ہے کہ دوسری آبادکار طاقتوں کے مقابلے میں مہربان، یورپین زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔ ''پہلے آنے والے فاتحین صرف دولت، بیگار اور عورتیں مانگتے تھے۔ لیکن یورپین یہ چاہتے تھے کہ ہم اپنے بارے میں ہی ایک لاعلاج دائمی احساسِ کمتری قبول کر لیں اور اس کمتری کا مستقل اعتراف کرتے رہیں..... انھوں نے انسانیت پر یہ ناقابل معافی ذلت مسلط کر دی کہ تمام دنیا کو ایک وسیع و عریض پرائمری سکول بنا دیا جس میں سفید چمڑی والے استاد تھے اور کالوں کو زیادہ سے زیادہ شاگردوں کے مانیٹر کا مقام ہو سکتا تھا اس سے آگے کچھ نہیں۔ شاید لوٹ مار اور غارتگری کی بڑی سے بڑی مثال نے بھی انسانی وقار کو اتنا دھچکا نہیں پہنچایا ہوگا جتنا نسلی غرور اور سماجی احساسِ ذمہ داری، کے اس ہولناک آمیزے نے پہنچایا۔''

محکوم قوموں کے بارے میں اس قسم کا رویہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی پہلی چند دہائیوں میں خاص طور پر نظر آتا ہے اور اس رویے کی بعد کی نمو میں نظریۂ ارتقا اور اس تکنیکی ہوشیاری کا بہت دخل ہے جو یورپین نسلوں کی ارتقائی برتری ثابت کرتی تھی۔ لیکن اگر ''نسلی'' کا لفظ نہ بھی استعمال کیا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غرور اور سماجی احساسِ ذمہ داری کا امتزاج ہی اس جدید رویے کی بنیاد ہے جو اپنے سے کمتر یا بدنصیب لوگوں کے لیے روا رکھا جاتا ہے۔ کہیں کہیں یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جس قسم کے لوگوں کے لیے پہلے ''خبیث'' یا ''بد'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا اب ان کے لیے ''کمتر'' کا لفظ استعمال ہونے لگا ہے۔ بدی یا خباثت کے ساتھ پھر بھی رعب کا عنصر شامل ہوتا ہے جبکہ ''کمتری'' سے یہ عنصر بالکل غائب ہے اور ظاہر ہے کہ خبیث شخص کی نسبت کمتر شخص کے ساتھ نرمی سے پیش آنا آسان ہے۔ اس اعتبار سے ''شر پسند عناصر'' (اکثر ممالک میں انھیں اسی نام

سے پکارا جاتا ہے) اس نئے عنوان کے تحت بہتر حالت میں ہیں اور یہ ان کی نہایت 'ناشکری' ہے کہ وہ اپنے ساتھ بیوقوف بچوں کی بجائے بالغ بدمعاشوں جیسا سلوک کروانا پسند نہیں کرتے۔

''بعض جرائم پیشہ لوگ بچگانہ ذہنیت رکھتے ہیں یا بچوں جیسی حرکتیں کرتے ہیں''، یہ اسلوبِ بیان بہت گمراہ کن ہے۔ اس کے کہنے والے کو سچ مچ کے بچوں کے ساتھ رکھ دینا چاہیے کہ اپنی غلطی کا احساس ہو سکے۔ معاشرہ دنیا کے اتھاہ اور مہیب سمندر میں ایک محفوظ جزیرے کی مانند ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ خود کو مطلق اور محیط سمجھ لے اور جو لوگ اس کے نظام میں پورے نہیں اترتے، انھیں انسان ماننے سے انکار کر دے۔ مجرم معاشرے کے سکون میں ہلچل پیدا کرتا ہے اور دوسرے انسانوں کا حق غصب کرتا ہے اس لیے سزا کا مستحق ہے لیکن سزا اسے انسان سمجھ کر دی جانی چاہیے، بیمار جان کر نہیں!

اب سزا کے تصور کی جگہ اصلاح اور بحالی کے نظریات نے لے لی ہے، لیکن اس سے معاشرہ اپنی ایک قبیح مگر انتہائی اشد ضرورت کی تسکین سے محروم ہو گیا ہے۔ کئی جرائم ایسے ہوتے ہیں (مثلاً بچوں کا قتل) جو اکثر لوگوں میں غصے اور ہول کی شدید کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر گھٹتے رہتے ہیں اور اس غصے کا نکاس تبھی ہو سکتا ہے جب وہ مجرم کو اسی قسم کی اذیت سے گزرتا دیکھ لیں جیسی اس نے اپنے معصوم شکار کو اور اپنے معاشرے کو پہنچائی تھی۔ ایسی سزا دینے کے لیے مجرم کو برابر کا انسان سمجھنا ضروری ہے ایک کمتر بیمار سمجھنے سے کام نہیں چلے گا۔ پرانے لوگ اس بات سے آگاہ تھے کہ شدید گھناؤنے جرم انسانی معاشرے کی صحت اور توازن کو متاثر کرتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں تبھی بحال ہو سکتی ہیں جب کہ سزا بھی اتنی ہی خوفناک ہو جتنا کہ جرم۔ دو تاریکیوں سے ایک اجالا تو نہیں بن سکتا لیکن یہ کئی دفعہ ایک دوسرے کو متوازن کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کا توڑ بھی کر ڈالتی ہیں اور اس طرح فطری زندگی کا پلڑا برابر ہو جاتا ہے۔

ایک دوسرے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اب تو جدید معاشرے خود ہی ایک وسیع و عریض قید خانہ بن کر رہ گئے ہیں جو اپنے ارکان کو پوری طرح اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں، چاہے ان کا دم ہی کیوں نہ گھٹنے لگے۔ اس کی ایک مثال سرحدوں کی بندشیں اور آزادانہ سفر پر لگائی جانے والی پابندیاں ہیں۔ پاسپورٹ، ویزے، پرمٹ سب افراد کو اس کے معاشرے کی سرحدوں میں اس طرح قید رکھنے میں مدد دیتے ہیں کہ وہ فرار کا خواب دیکھنے کے لیے یا تو غنڈہ گردی کا راستہ کھلا رہ جاتا ہے یا خودکشی کا۔

ان لوگوں کو چھوڑ کر جو بلند تر مرتبۂ وجود کی آگہی رکھتے ہیں اور انسانی معاملات کے سرچشمے سے وابستہ ہیں، باقی لوگوں کے لیے دیوانگی کا رستہ ہی باقی رہ جاتا ہے اور جوں جوں بچی کھچی طبیعاتی سرحدیں بند ہونے لگتی ہیں اس راستے کو اختیار کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ممکن ہے وہ معاشرے جو مطلق بن بیٹھے ہوں اسی طریقے پر خود کو تباہ کرلیں اور ان کے لیے کسی عذاب آسمانی کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ جب معقول اور سمجھدار لوگ سماجی ڈھانچے کو عقل کے تابع کرنے اور اس کے گرد فولادی دیواریں تعمیر کرنے میں حد سے بڑھ جائیں تو پھر دیوانوں کو ہی باگ ڈور سنبھالنی پڑے گی۔

جرم سے اب ہم دیوانگی کی طرف آتے ہیں کہ دیوانگی یا جنون اب بھی لوگوں میں ایک طرح کے خوف کو جنم دیتا ہے لیکن اس خوف میں سے ہیبت کا عنصر غائب ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ دیوانوں یا ذہنی مریضوں کو بھی اسی طرح سمجھو جس طرح جسمانی مریض اور اس پر رحم کھاؤ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص جو ہوش وحواس کھو بیٹھا ہے یا ذہنی خلل میں مبتلا ہو گیا ہے وہ اس شخص سے سراسر مختلف ہے جس کا پاؤں یا ٹانگ کٹ گئی ہو۔ ذہنی مریض نے اگر 'توازن کھویا ہے' تو جانے اس کے بدلے میں کیا پالیا ہو؟ ہمیں ذہنی شفاخانوں میں کام کرنے والے ڈاکٹر خود بھی تھوڑے سے 'غیر متوازن' اس لیے لگتے ہیں کہ ان کا واسطہ ہر روز تجربے کی نئی دنیاؤں سے رہتا ہے اور ان تجربوں میں بھی ویسی ہی خودرفتگی ہے جیسا کہ ہماری دنیا میں۔

اسلامی دنیا میں دیوانگی کے لیے ایک قسم کی ہیبت اور احترام پایا جاتا ہے کیونکہ مسلمانوں میں روایتی طور پر ایک احتیاط پائی جاتی ہے کہ ''کیا جانیے کہ وہ.....'' اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان جانتے ہیں کہ پیغامِ الٰہی کا بوجھ سہارنا کیسا کٹھن کام ہے۔ عام انسانوں میں کتنے لوگ ہیں جو اپنی تمامتر صلاحیتوں کے باوجود دست ربانی کا بوجھ برداشت کر سکتے اور جب وہ روحانی تجربے سے گزرتے ہیں تو ان کی دنیاوی شخصیات اس بوجھ تلے منتشر ہو جاتی ہیں۔ اسلام میں اور باقی تہذیبوں میں بھی مجذوبوں کا وجود ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اس لیے جو نفسی طبیب ذہنی ہسپتالوں میں کام کرتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز کرتا ہے وہ انتہائی ناتجربہ کار اور ناپختہ ہے۔

پرانے وقتوں میں خیر خواہی کا تصور اس حقیقت سے نکلا تھا کہ چونکہ ہم نہیں جانتے کہ کسی شخص کے اندر کیا ہے (چاہے وہ دیوانہ ہی ہو) اس لیے ہر شخص کا احترام کرنا چاہیے۔ جب ہم انسان کی

اندرونی اور اصلی حقیقت کی بات کرتے ہیں تو الفاظ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور براہ راست بیان کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

قرنوں پرانے عقائد کی رو سے انسان کیا ہے؟ عیسائیت کے نزدیک انسان صورت الٰہی پر تخلیق ہوا۔ اسلام کے نزدیک وہ خدا کا نائب ہے جسے ذات ربانی نے مقرر کیا اور جو تمام مخلوق میں بالاتر ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک انسان کے وجود کا مرکز ابدی اور لامنتہا برہما ہے اور بہت سی قدیم قوموں نے انسان کو کائنات کے اس مرکزی وجود کا درجہ دیا ہے جو باقی مخلوق کے مقابلے میں یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ عرش اور زمین کے درمیان رابطے کا کام کر سکے۔ ہم یعنی پوری نوع انسانی آج تک انسان کو وہ واحد مخلوق مانتے رہے ہیں جو اپنے خالق کی اجازت سے اختیار مطلق کی مالک ہے۔

یہی نظریہ تمام تر عبادت اور مذہبی پیشوائی کی بنیاد ہے۔ اسی کے تحت انسان قبل از تاریخ کے زمانے اور تاریخ میں بھی، زندگی بسر کرتا رہا ہے۔ انسان یا تو خدا کا نائب ہے یا پھر صرف ایک حیوانِ ناطق جو اپنی ہوشیاری اور تکنیکی ترقی سے تیز کیے ہوئے دانتوں کی مہارت کی بنا پر خصوصی حقوق کا طلب گار ہے، ایسا حیوان جس کا وقت اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ اگر وہ حیوان ہے تو اس کو کسی قسم کے کوئی حقوق حاصل نہیں، وہ نرا گوشت کا ڈھیر ہے۔ اور تمام حیوانات حتیٰ کہ حشرات الارض بھی شاید دل ہی دل میں اسے اپنی مکمل تباہی کا سامان خود کرتے دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔ لیکن اگر وہ نائب خدا ہے تو خدا کی تخلیق کی ہوئی دنیا میں ہونے والی تمام تر تباہی اور انحطاط کی ذمہ داری ایک حد تک اس پر ضرور عائد ہوگی۔

یہ ایک ناگزیر انتخاب ہے۔ اگر انسان وہ ہے جیسا اسے جدید دنیا میں سمجھا جاتا ہے تو پھر وہ کسی طرح حیوانوں سے بہتر نہیں اور اگر انسان وہ ہے جیسا اسے ہمیشہ سے سمجھا جاتا تھا تو پھر اس کے کمزور شانوں پر خلقِ خدا کا بوجھ بھی لدا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسا شریف زادہ ہے جو شراب اور شباب کا دلدادہ ہو چکا ہے اور اس بوجھ کو اٹھانے کا متحمل تبھی ہو سکتا ہے اگر وہ کسی مافوق الفطری ماخذ سے قوت حاصل کرے۔ ایک عام آدمی کے ساتھ یہ تصور کچھ مہمل سا لگتا ہے کہ وہ خدا کا خلیفہ ہے یا صورت الٰہی پر بنا ہے لیکن ہمیں رسول خدا کا وہ قول یاد رکھنا چاہیے کہ ''احسان یہ ہے کہ تم اس طرح عبادت کرو گویا کہ خدا کو دیکھ رہے ہو کہ تم اگر اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔'' اصل بات یہ ہے کہ ہم اپنے اصل منصب کو یاد رکھیں اور اسے پورا کرنے کے ارادے پر قائم رہیں۔

ہماری نیت یہی ہونی چاہیے کہ ہم اس طرح عمل کریں ''گویا'' ہم وہی ہوں جو ہماری اصل حقیقت ہے۔ باقی سب توفیق پر منحصر ہے۔ آخر کار نائب یا خلیفہ بھی بادشاہ کی مدد اور فرمان کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ وہ تو اس ذات کا حکم بجالاتا ہے جس نے اسے زمین پر یہ اختیار تفویض کیا ہے۔ اسے کسی اور نے مقرر کیا ہے، اسے اختیار کسی اور سے ملا ہے اور وہ کسی اور کے عکس کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن عکس بھی کیا شاندار عکس ہے۔

منصبِ انسانی کی بھرپور تکمیل تو ہبوط سے پہلے سنہری دور میں حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہی میں ممکن تھی اور ہم اس بدنما دنیا میں کمال حاصل کرنے کی امید نہیں کرسکتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم جو تھوڑی بہت کوشش کرسکتے ہیں وہ بھی نہ کریں۔ بنیادی امتیاز ان دو قسم کے لوگوں کے درمیان ہے جو انسان کے اس جوہر کو پہچانتے ہیں اور وہ جو اپنی کورنگاہی میں اس شناخت کو رد کررہے ہیں۔

انسان کو باقی مخلوقات پر جو برتری حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ اس نے بارِ خلائق کی اس یکتا امانت کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ جب تک وہ اپنی اس ذمہ داری سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے، وہ انسان ہے جب وہ اسے بھول جاتا ہے وہ ادنیٰ جانوروں کے درجے تک رہ جاتا ہے جو پیٹ بھرتے ہیں اور اپنے جیسے دوسرے جانوروں کو پھاڑ کھاتے ہیں۔

لیکن باقی مخلوقات پر برتری سے یہ مراد نہیں کہ انسان حیوانات پر مکمل حق رکھتا ہے اور انھیں جیسے چاہے استعمال کرسکتا ہے۔ حیوانات کو قربانی کے لیے استعمال کرنے کا تصور بھی بعض مذاہب میں موجود ہے جیسے یہودیت یا اسلام میں اور ان کا خون بہانے اور انھیں کھانے سے پرہیز کا تصور بھی جیسے بدھ مت یا ہندومت میں۔ قربانی کے تصور کے پیچھے یہ نظریہ ہے کہ حیوان اپنی قربانی کے ذریعے انسان کو طاقت فراہم کرکے نجات کے اس عمل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں جو تمام تر مخلوقات پر یکساں محیط ہے۔ پھر عیسائیت کے ابتدائی دور میں یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ کس طرح ایک انتہائی خونخوار درندہ بھی کسی برگزیدہ ہستی کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے ''زمین پر رہنے والے تمام چرندے، پرندے اور درندے تمہاری طرح جاندار ہیں۔'' اسی لیے دنیا کی مختلف النوع روایتوں میں جانوروں سے مہربانی کا سلوک کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

اس قسم کی ہدایتوں کو محض توہم یا دیومالا نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس میں اصل نقطہ یہ ہے کہ انسان کو بحیثیت خلیفہ چند خاص مراعات حاصل ہیں لیکن ان مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا حق حاصل

نہیں ہے اور ان ہدایات میں جس مہربانی کی تلقین کی گئی ہے اس کی بنیاد تمام مخلوقات کے لیے احترام اور ہیبت کے جذبے پر ہے۔ ایک زمانے میں دنیا انسانوں اور حیوانوں پر مشتمل تھی۔ آج کی دنیا ایک انسانی دنیا ہے جس میں کوئلہ، تیل اور خوردنی جانور ایسی قابل استحصال دولت ہیں جو صرف ہمارے استعمال کے لیے موجود ہیں۔

آج کل ہم جانوروں خاص کر کتوں کو جس طرح پالتو بنا کر عزیز رکھتے ہیں وہ بھی کوئی قابل تحسین بات نہیں۔ دوسری طرف انھیں تجربہ گاہوں میں طبی اور کیمیائی تجربوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس معاملے میں تمام روایتیں ہم خیال ہیں۔ یہ تخلیق اور مخلوق کے خلاف ایک جرم ہے اور یوں ہم خالق کے بھی مجرم ہیں۔ اگر ہمیں اپنی عمریں طویل کرنے کا ایسا ہی شوق ہے تو اس کے لیے خود پر تجربات کریں بچارے جانوروں کو کیوں نشانہ بناتے ہیں؟ یہ صرف ظلم یا اذیت دینے کا سوال نہیں بلکہ استحصال اور احترام سے محروم کرنے کا جرم ہے۔ مثلاً ضروری نہیں کہ جو حکومتیں استبداد نہ کریں وہ انسان کے حق میں اچھی ہوں۔ اسے اس کی آزادی اور وقار سے محروم کرنا بھی بہت بڑا ظلم ہے۔

دنیا کی باقی مخلوقات کے ساتھ ہماری اس بے پروائی اور استحصال کی وجہ یہ ہے کہ ہم قہر الٰہی سے بے خبر ہو چکے ہیں۔ ہم معاشی عدم تحفظ اور سماجی معیاروں سے خوفزدہ اور سیاسی حقوق کے لیے تو فکر مند رہتے ہیں لیکن عذاب ربانی سے قطعاً بے خوف ہیں۔ ایٹمی جنگ یا کیمیائی بم کے ہول سے لرزتے رہتے ہیں لیکن یہ غور کرنے کی تکلیف نہیں کرتے کہ یہ عذاب ہم پر آخر نازل کیوں ہو رہے ہیں؟

کہتے ہیں کہ جانور انسان کو آئینہ بھی دکھاتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں قدیم دور کے ایک صوفی کی حکایت ملتی ہے جو کہا کرتے تھے کہ ''جب مجھ سے کوئی لغزش ہو جائے تو مجھے اپنے خچر کے مزاج سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کوئی بھول ہو گئی'' ایک دفعہ صحابہ نے رسول مقبول ﷺ سے پوچھا کہ ''کیا جانوروں سے نیکی کا بھی اجر ملتا ہے؟'' آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اگر کسی جاندار کی پیاس بجھاؤ تو اس کا بھی اجر ہے۔''

لیکن معاملہ صرف جانوروں تک محدود نہیں ہے۔ انسان کے منصب خلافت کی ذمہ داریوں میں پوری کائنات اور اس کی ہر شے شامل ہے۔ وہ اس کی شفاعت کر سکتا ہے یا اس کا استحصال کر سکتا ہے۔ زمین پر اپنا منصب پورا کرنے کے لیے ہم تمام فطری اشیا اور وسائل کو استعمال کر سکتے

ہیں۔ انھیں خوراک، تجارت، لباس اور اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے بروئے کار لا سکتے ہیں لیکن یہ رعایت مشروط ہے۔ عیسائیوں کا مقولہ ہے کہ دھرتی خالق کی ملکیت ہے۔ ہم اس کو استعمال کر سکتے ہیں مگر بحیثیت مالک نہیں..... پرانے لوگوں میں شیطانوں یا بدروحوں کا جو خوف تھا اس کی بنیاد دراصل اس علم پر تھی کہ دنیا کی تمام اشیا کا ہم پر حق ہے اور اگر اس حق کو نظر انداز کیا گیا تو اس کے نتائج بھگتنے پڑیں گے۔ یہ شیطان نہیں تھے جو جنگل کا آسیب تھے یا دیوانے آدمی کے خوابوں میں آتے تھے۔ بلکہ نتائج کا خوف تھا اور غربت یا افلاس کو جو تمام مذاہب میں قابل تحسین سمجھا گیا ہے تو اس کی محض انفرادی یا اخلاقی اہمیت پیش نظر نہیں تھی بلکہ یہ خیال کارفرما تھا کہ انسان کو اپنے طبعی ماحول کو استعمال کرنے میں محتاط رہنا چاہیے۔ وہ اس کے ساتھ وہ سلوک نہیں کر سکتا جو ایک بچہ مٹھائیوں کے لفافے کے ساتھ کرتا ہے۔

فرائض کے ساتھ بہرحال مراعات تو ہوتی ہیں اور انسان اس لحاظ سے یکتا ہے کہ بے جان اشیا کو صورت عطا کر کے انھیں خوبصورت بنا دیتا ہے اور خام مادے میں پوشیدہ معانی کو عیاں کر دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں یہ دوپایہ خود کو ''قصر سلطانی کا مالک'' کہہ سکتا ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے شرف عطا کر سکتا ہے۔ سارے کا سارا فن مقدس اس یقین پر مبنی ہے کہ فنکار اپنے مرکزی کردار اور اپنے ہنر کے حوالے سے عرش اور فرش کے درمیان ایک رابطے، ایک وسیلے کا کام کرتا ہے اور اس کے ذریعے الوہی نقوش ہمارے ارضی ماحول کو منور کرتے ہیں۔ کسی مقدس فنی روایت کے اصول اور ہیئتیں اس طرح معانی کو بیان کرتی ہیں جس طرح زبان کے الفاظ جو صرف خوش آواز حروف ہی نہیں بلکہ کچھ کہنے کے آلات ہوتے ہیں۔ بامعنی صورتوں کو انسانی ماحول میں تخلیق اور تحلیل کرنا انسان کے منصب خلافت کا حصہ ہے۔

یہاں اب ہمارے سامنے دو رویے واضح ہو گئے ہیں اور ان کے درمیان کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف ایک ایسی دنیا ہے جو تخلیقِ جمال کا مواد فراہم کرتی ہے اور دوسری طرف وہ دنیا جو حیوانِ انسانی کا راتب ہے اور اس کے کارخانوں کا ایندھن۔ پچھلے ایک باب میں ہم نے ان چیزوں کا ذکر کیا تھا جو تغیر کے دھارے سے دیرپا استعمال کے لیے نکالی جاتی ہیں یا پھر وہ چیزیں جو محض 'انسان اور فطرت کے نظام، میں نگلی اور خارج کی جاتی ہیں۔ اس تقدیس کے حوالے سے جو کبھی انسان کے لیے طبعی تھی، حسن ایک آسایش نہیں بلکہ کسی شے کے استعمال کی لازمی شرط ہے۔

اس طویل انسانی تاریخ میں پہلی بار ایک تہذیب کو تخلیق کرنے کا اعزاز ہم اُنیسویں اور بیسویں صدی کے لوگوں کے حصے میں آیا ہے۔ صنعتی دور نے بہت سے فوائد پہنچائے ہیں لیکن اس نے انسان کے لیے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا ہے جو دیکھنے میں ایک بھیانک خواب سے کم نہیں۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو یہ کہیں گے کہ یہ ماحول خود بھی ایک بھیانک خواب کی پیداوار ہے، ایسا قابوس جس میں انسان اپنا وقار اور اپنا ورثہ کھو بیٹھا ہے اور ایک بے معنی دنیا میں اپنی بے لگام خواہشات کے ہاتھوں خوار و زبوں ایک درندہ بن کر رہ گیا ہے۔

جدید دنیا کی دولت بے اکتساب ہے کہ انسان کو اپنے ماحول سے فائدہ اٹھانے کا حق تب حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنے منصب خلافت کو کسی نہ کسی حد تک ادا کر دے۔ قدیم نقطۂ نظر یہ تھا کہ انسان نے صرف وہی کچھ کمایا ہے جسے وہ روحانی طور پر جذب کر سکے، جسے وہ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ پیار بھی کر سکے اور جسے وہ ابہام سے نکال کر معانی اور حسن کی روشنی میں لا سکے۔ اس کے سوا سب چوری کا مال ہے۔

سماجی اخلاقیات انسانوں کی چوری کی تو بہت مذمت کرتی ہے لیکن فطرت سے انسان جو کچھ چراتا ہے اس پر اس کی نظر نہیں جاتی۔ جب اخلاقیات صرف انسانی اور سماجی سطح تک محدود ہو کر رہ جائے اور دوسرے انسانوں کے حقوق کے علاوہ ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کو غیر متعلق قرار دے کر رد کر دے تو پھر ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے پورا کرنے کے لیے سماجی اخلاقیات حد سے زیادہ پھیل جاتی ہیں اور ایک عملی ضرورت سے بڑھ کر ایک مطلق حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ سماجی اجتماع کا ذاتی مفاد یہ اجتماع ایک حیوان کی مانند اپنے مفاد کے علاوہ ہر چیز سے بے خبر ہے اور یہی بے خبری بالآخر اس کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔

موجودہ دور میں صورت حال یہ ہے کہ ہم وقت کے ایک مخصوص لمحے کے مفروضات کو ہر کسی پر تعلیمی نظام اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس صورت حال کو درست تبھی کیا جا سکتا ہے جب اسے کسی بالکل مختلف صورت حال کے مقابل لایا جائے جو انسان کی تقدیر اور فطرت کے بارے میں سراسر جداگانہ مفروضات پر مبنی ہو۔ پچھلے دو سو سالوں میں یورپین قوموں نے بہت سے قدیم تمدن تباہ کیے یا ان میں فساد برپا کیا جو (اگر ہم میں دیکھنے کا حوصلہ اور دیانت ہو تو) ہمیں ایسا آئینہ مہیا کرتے ہیں جس میں ہم اپنے بارے میں وہ سب کچھ جان سکتے ہیں جو جاننا چاہیے۔

تمدن کی اس عالمگیر بربادی کی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی کہ کیمونسٹوں سمیت اکثر جدید مؤرخین تاریخ کو اپنے نظریات کے مطابق توڑ مروڑ لینے کے ماہر ہیں۔ یورپین تہذیب کے افریقہ یا ایشیا کے کسی گوشے پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں تو اس پر ایک طویل مطالعہ ہوسکتا ہے لیکن فی الحال ہم صرف ایک روشن اور نہایت نمایاں مثال پر اکتفا کریں گے جو جدید دنیا کے قلب میں واقع ہے یعنی گوری چمڑی والوں اور جنوبی امریکہ کے انڈین لوگوں کے درمیان مڈبھیڑ۔

یورپین یورش کے وقت شمالی امریکہ میں ریوگرینڈ سے پرے چھ سو کے لگ بھگ ریڈ انڈین اقوام یا معاشرتی گروہ آباد تھے۔ ان گروہوں نے مل جل کر اتنے گوناگوں مذہبی اور سماجی اطوار کو جِلا دی اور انھیں جسم و روح کی سطح پر بسر کیا کہ اگر پوری صفحۂ ہستی پر اور کوئی انسان نہ بھی بستے تب بھی انسانی امکانات کی رنگارنگی اور زرخیزی اپنے عروج پر ہوتی۔

اس کے باوجود اس حیرت انگیز کثرت میں ایک خاص قسم کی وحدت پائی جاتی تھی جو انسان کے منصب خلافت کے تحقق پر مبنی تھی۔ بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کثرت دراصل وحدت کے اس امر سے پھوٹی تھی۔ ان لوگوں میں وہ انمول انسانی جوہر تب بھی باقی تھا جو باقی اقوام کے لیے ایک اساطیری خواب بن چکا تھا۔ کنواری دھرتی کے جنگلوں، کوہساروں، میدانوں اور صحراؤں میں بسنے والے ان انسانوں میں فطری ماحول میں اپنے اردگرد رہنے والی مخلوق کے لیے ایک حد درجے کا لحاظ پایا جاتا تھا اور وہ انتہائی دلیرانہ کوشش سے ایک تاریک دور میں ابتدائی دور زریں کی یاد تازہ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں آسمانی طاقتوں کا جو شعور پایا جاتا تھا اس اعتبار سے وہ ایسے انسانی اوصاف کا نمونہ تھے جن کا آج ہم تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس نمونے اور مثال کو جدید دور میں قابل تحسین سمجھا جانا چاہیے اس لیے کہ ہم انسانی شخصیت کی نشوونما پر بہت زور دیتے ہیں۔ انڈین فن کا اصل مرکز اس کی اپنی ذات تھی۔

شوآں کے الفاظ میں یہ فن ''مرتکز، براہ راست اور بے باک'' ہوتا ہے اور انسانی ذات کے لیے ایک قالب عمل کا کام کرتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص ماحول میں، ستاروں، آسمان، طبعی عناصر اور جنگلی درندوں کی ایک خاص آگہی رکھتے تھے اور اسی خلعت میں ملبوس تھے جو تخلیق کے قصرِ عظیم کے سلطان کو ہی زیب دیتی ہے۔'' اس کے مزین اور مرصع پروں والے ٹوپ، جھالروں سے سجے ہوئے لباس، ان پر شمسی علامتوں کی کشیدہ کاری اور حسین سادگی سے بنے ہوئے زنانہ ملبوسات بھدے پن اور یکسانیت کو یکسر مسترد کردیتے تھے۔''

انسان وہ لباس پہنتا ہے جو اس کا تمدن اسے دیتا ہے لیکن روایتی معاشروں میں وہ اس طرح ملبوس ہوتا تھا یا چہرے پر نقش و نگار بناتا تھا جو اس کی اندرونی حقیقت کی مرئی صورت میں نمائندگی کریں۔ اگر وہ دیوتاؤں کا بہروپ بھرتا تھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ اس کے وجود کے باطن میں خدا ہے اور اس کا وہ بہروپ تھا جو اس کے اندر کی ابدی حقیقت کو منعکس کرتا تھا اور گوشت پوست کے بدلنے والے اور وقت کے دھارے میں بوڑھے ہو کر تحلیل ہونے والے جسم کی پردہ پوشی کرتا تھا۔

شوآں کا کہنا ہے کہ شمال امریکی انڈین خود کو زمین پر قائم نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اشیا اگر وقت کے ساتھ تحلیل نہ ہوں تو منجمد یا پتھرا جاتی ہیں۔ اسی لیے وہ مکان بنانے (خاص طور پر پتھر کے مکان) اور لکھنے سے چڑتا تھا کہ اس طرح اس کے نقطۂ نظر کے مطابق روح کے مقدس بہاؤ میں ٹھہر جاتا ہے، مرجاتا ہے..... سرخ آدمی کے لیے ساری دنیا ایک عبادت گاہ ہے اسی لیے وہ دھرتی کو اچھوتی، کنواری مکمل اور مقدس رکھنا چاہتا تھا جس طرح وہ دست ربانی سے نکلنے کے بعد تھی۔'' کئی عبادتیں ایسی تھیں جن میں وہ مخلوق کے سامنے خود کو جھکاتا تھا کہ وہ اس سے پہلے تخلیق ہوئی تھیں اور احترام کی مستحق تھیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان سب سے بلند مرتبہ تھا کہ وہ ''روحِ اکبر'' (Wakan Tanka ریڈانڈین اصطلاح) کو جان سکتا تھا۔ بحیثیت خلیفہ وہ اپنے مالک کو جانتا تھا اور اس کا حکم بجالاتا تھا اور اس حیثیت میں وہ مالک کی کائنات سے دوستی رکھتا تھا اور اس کا احترام کرتا تھا۔

گورے آدمی نے اس قسم کے تمدن پر جو اثرات ڈالے وہ اتنے الم ناک ہیں کہ ہمیں انھیں پہچاننے کے لیے ریڈانڈین نظریۂ زندگی سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ حالانکہ یہ نظریہ وہی ہے جو تمام انسانی تاریخ میں مروج تھا اور اسے یکدم مسترد کرنا انتہائی کور دماغی ہوگی۔ سب سے ضروری امر یہ ہے کہ ہم ایک لمحے کے لیے یہ اعتقاد ایک طرف رکھ دیں کہ ہمارا طرز زندگی اور طرز فکر ہی اکلوتا جائز طریقہ ہے اور غیر متعصبانہ نظر سے ''تمدنوں کے اس تصادم'' کو دیکھیں۔

لیکن اگر ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ جدید نکتۂ نظر روایتی عقائد کے مقابلے میں ایک ضلالت کی حیثیت رکھتا ہے (یا کم از کم ایک حالتِ جہل کی طرح ہے) تو پھر جو کچھ اس تصادم میں ہوا وہ محض المناک نہیں بلکہ شیطانی تھا اس لیے کہ ان پلوں کو تباہ کرنا جو دھرتی کو عرش سے ملاتے ہیں اور انسان کو اس کے منصب خلافت کی تکمیل کے ذرائع فراہم کرتے ہیں، ایک شیطانی عمل ہے اور اس کے جلو میں پوری دنیا کے لیے نہایت بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔

''جنوبی اور شمالی امریکہ کی ریڈانڈین نسل اور اس کی روایات اور ثقافت کی سوچی سمجھی، شعوری، منظم اور سرکاری سطح پر تباہی انسانی تاریخ کے گھمبیر ترین جرائم اور غارتگری کی مثالوں میں سے ایک ہے۔'' جو لوگ خود کو ایک بے معنی کائنات کے قیدی محسوس کرتے ہیں وہ اپنے درمیان ایسے لوگوں کا وجود برداشت نہیں کر سکتے تھے جنھیں دنیا میں معانی نظر آتے ہوں اور اس لیے ریڈانڈین کی روحانی زندگی کے ڈھانچے کو تباہ کرنا ضروری تھا۔ سی اوکس علاقے میں پہلے فوجی قوت کے سہارے ''رقصِ آفتاب'' کو مٹا دیا گیا۔ پھر مشنری پادریوں نے اس پر قانونی پابندی لگانے کے لیے انڈین امور کے دفتر پر زور دیا تا کہ ایسی تمام عبادات اور ''مشرکانہ'' رسوم کو ممنوع قرار دیا جائے جو ریڈانڈین لوگوں کو عیسائیت کی تہذیب کو قبول کرنے سے روکتی تھیں۔ وزارتِ امور داخلہ نے ایک فوجداری قانون بنا دیا جس کے تحت انڈین مذہبی رسوم کی ادائیگی کی ممانعت کر دی گئی۔'' گورے آدمی نے اس قسم کے اقدام عیسائیت کے فروغ کے لیے نہیں کیے تھے نہ ہی وہ ریڈانڈین پر بحیثیت عیسائی کے مسلط ہوا تھا بلکہ یہ ایک ایسے جتھے کی یلغار تھی جو بنجر توہمات کے زیر اثر پہلے ہی اپنے روحانی ورثے سے محروم ہو چکا ہو۔

یہ حملہ آور تاریخ کے تمام سابقہ حملہ آوروں سے مختلف تھے کہ وہ حملہ آور تو محض اپنی فراداں توانائی کے وفور میں سرحدوں کو توڑتے اور وسیع کرتے تھے۔ جبکہ یہ لوگ اتنے گر گئے تھے کہ خدا کی تخلیق کی ہوئی ہر چیز کو محض استحصال کا مواد سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ درخت صرف ایندھن تھا، بکری محض گوشت اور پہاڑ صرف گودام بنانے کی جگہ۔ یہ یک رخی ہوس جو اب انسان کے لیے فطری سمجھی جانے لگی ہے اٹھارویں، انیسویں صدی کے ریڈانڈین لوگوں کے لیے اتنا بڑا عجوبہ تھی جیسے سفید حملہ آور کسی اور سیارے سے آئے ہوں۔ سفید آدمی حرص، لالچ، خیانت اور فریب کا ایسا امتزاج تھا کہ اس کے لیے آج بھی ریڈانڈین زبان میں کوئی لفظ ڈھونڈنا مشکل ہے اور ریڈانڈین اس کا ذکر کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ سفید آدمی کی شکل میں انھیں ایسی رذالت اور گھٹیاپن سے واسطہ پڑا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انسان ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن ہوا و ہوس سے اس کے اپنے ہنر پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ حملہ آور جو ریڈانڈین لوگوں کے نزدیک جاہل، جسمانی طور پر غلیظ، شراب میں دھت، لاقانونی اور لادین تھے، اپنے ہاتھوں میں مہلک ہتھیار لیے پھرتے تھے اور ان تمام مراعات سے لطف اندوز ہوتے تھے جو غیرت مند آدمی کے مقابلے میں بے اصول شخص کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ شکاری جتھے ایک ایسی زمین پر پھیل گئے جو

طلسماتی دولت سے مالا مال، اچھوتی اور تاراج ہونے سے بچی ہوئی تھی۔ جس کے درخت معبد کے ستونوں کی طرح تھے اور زمین پر صرف خلیفۂ خدا ہی قدم دھر سکتا تھا اور پھر ان وحشی حملہ آوروں نے خود کو اس کارنامے پر مبارکباد دی کہ اپنے تہذیبی مشن میں اس قدر کامیاب رہے۔

اس مشن کے شکار اور نشانہ بننے والوں کا جو ردعمل تھا وہ ایک امریکی کمشنر برائے انڈین امور سے سنیے۔ ''ان پر ایک ایسا اندوہ طاری تھا جو الفاظ کے احاطے سے باہر ہے۔ اس شخص کا اندوہ جو پورے شعور کے ساتھ اپنی دنیا کو لاتعداد، پرعناد دشمنوں کے ہاتھوں تباہ ہوتا دیکھ رہا ہو.....۔ جان کولیئر جسے ان لوگوں کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، لکھتا ہے:

ان لوگوں میں ابھی وہ کچھ موجود تھا جسے باقی دنیا کھو چکی ہے — دھرتی اور اس پر پھیلے ہوئے زندگی کے تانے بانے کے لیے احترام اور محبت۔

جان کولیئر اس اندوہ اور گہری اداسی پر بہت زور دیتا ہے جو ریڈ انڈین لوگوں کے سفید آدمی سے معاملات میں غصے کی بجائے نظر آتی تھی۔ اس اندوہ میں شاید ہم سب کے لیے رحم بھی شامل تھا کہ آخرالامر انسانیت ایک اکائی ہی تو ہے۔

اس زمین پر جسے عرصے تک مقدس سمجھا جاتا رہا اور اس کے مادے کے ذرات سے جو ''روح الاکبر'' کی خلعت کے موتی کے برابر تھا۔ پہلے ایٹمی ہتھیار بنائے گئے اور اس سرزمین کے اوپر جس کے تقدس پر کدال یا ہل کی ضرب لگانا بھی گوارا نہ تھا، سب سے پہلے ایٹمی بادلوں نے اپنا منحوس سائبان پھیلایا۔

جب مغرب کے آدمی سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ اگر اسے چناؤ کا موقع دیا جائے تو وہ کس زمانۂ تاریخ میں پیدا ہونا پسند کرے گا، تو وہ اگر سمجھدار ہوگا تو، زمانۂ حاضر کا انتخاب کرے گا۔ اس لیے کہ وہ بیسویں صدی کا آدمی ہے۔ اس کا چہرہ اور اس کے جذبات بیسویں صدی کے ہیں۔ موجودہ حالت میں کسی اور زمانے میں پہنچ کر وہ یقیناً انتہائی پریشان ہوگا۔ لیکن اگر وہ یہ فرض کر لے کہ دوسرے زمانوں کے لوگ یقیناً اذیتناک زندگی گزارتے ہوں گے اس لیے کہ اگر وہ ان کی دنیا میں ہوتا تو تکلیف محسوس کرتا تو یہ سراسر موضوعیت یا داخلی محسوسات کو حقیقت پر تھوپنے کی کوشش ہے۔ جو کچھ جدید دنیا مال و دولت کی شکل میں اسے پیش کرتی ہے وہ اس کی ضرورت ہے لیکن یہ ضرورت اس کی بیسویں صدی کے مزاج کا ایک پہلو ہے اور اس کے پاس یہ فرض کر لینے کا کوئی جواز نہیں کہ ہر زمانے میں سب لوگوں کی ضروریات یہی رہی ہوں گی۔

معذور شخص کو ایسی سہولتیں اور رعایتیں ملتی ہیں جو صحت مند شخص کے لیے قطعاً بیکار ہیں اور اگر ہم کائنات میں اصل منصب سے محروم ہو گئے ہیں تو یقیناً ہم ایک انتہائی حوصلہ شکن اور کمزور کرنے والی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں یعنی بے مصرف ہو جانے کا مرض۔ اگر انسان کو (جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا)، خدا کے استعمال کے لیے پیدا کیا گیا تھا یعنی ایک ایسے وسیلے کے طور پر جس کے ذریعے اس دنیا اور اس سے ورا عوالم کے درمیان رابطہ قائم رہ سکے، تو پھر اسے اور کسی آقا کی خدمت میں کوئی تسکین نہیں ملے گی۔ اپنے ہم جنسوں کی یا ریاست کی یا کسی نظریے کی خدمت یا پھر ایک متبادل کے طور پر شہوت کی غلامی یا پھر ہیجان کی جستجو میں بسر ہونے والی زندگی، یہ سب اس کی جگہ پر نہیں کر سکتے۔

وقت کے ساتھ جب انسان کی نظر کا غبار چھٹتا ہے اور اس کی خوش فہمیاں بھاپ کی طرح اڑ جاتی ہیں تو تھکا ماندہ ''کارِ خیر کرنے والا'' شخص، ریاست کی مشین کا گھسا ہوا پرزہ اور پریشان حال مثالیت پرست، اس عیاش شخص سے زیادہ مختلف نہیں جو ساری زندگی لذت اور لطف کے پیچھے بھاگتے بھاگتے سفرِ زیست انجام کو پہنچنے والا ہو۔ کسی بہت اہم چیز کی تشنگی سی رہ جاتی ہے۔ دنیاوی اور لادینی اقلیم کی تنگ حدوں کے اندر کچھ لوگوں کی زندگی باقی افراد سے مقابلتاً بہتر ہو سکتی ہیں اور کچھ کی بدتر لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ جب لوگ ایک ایسے اندھیرے کمرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہوں جہاں سے تمام تر روشنی غائب ہو چکی ہو، تو پھر وہ جو چاہے کر سکتے ہیں۔

سیوں ویل لکھتی ہیں: ''ہمارے لیے ممکن ہے کہ خدا اور خلقِ خدا کے اس حصے کے درمیان رابطے کا کام کریں جو ہماری امانت میں دیا گیا ہے۔ ہماری رضامندی ضروری ہے کہ وہ ہمارے ذریعے اپنی تخلیق کی ہوئی دنیا کا ادراک کرے۔'' اسی کتاب میں وہ آگے چل کر لکھتی ہیں ''جو مخلوق بھی مکمل اطاعت کی حالت کو پہنچ جائے وہ دنیا میں خدا کی موجودگی، علم اور عمل کی یکتا اور بے بدل صورت بن جاتی ہے۔''

جب ہمیں اپنی مضطرب اور طلب گار شخصیت کی بنائی ہوئی رکاوٹوں کو ڈھانے کی ہدایت کی جاتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ بے غرضی ایک مفید سماجی وصف ہے بلکہ اس لیے ہم ایک ایسا ستھرا وسیلہ بن سکیں جس کے ذریعے رحمتِ خداوندی کا نزول ہو سکے اور اس دنیا کی تمام اشیا کو حیات بخش سکے اور جس کے ذریعے دنیا میں حاصل کی گئی کامیابیاں اپنے اصل ماخذ کی طرف لوٹ سکیں۔ ہمارا لافانی پن ایک دیوار کی نہیں بلکہ ایک دریچے کی حیثیت رکھتا ہے۔

انسان زندگی بھر ایک سی حالت میں نہیں رہتا بلکہ مختلف مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔ جنین، بچہ، بالغ، بوڑھا۔ اسی طرح بچے کو صرف زیر تکمیل بالغ فرد اور بوڑھے کو صرف زوال آمادہ جوان نہیں جاننا چاہیے۔ ہمارا حتمی تشخص وہ ہے جو کچھ ہم کر چکے ہیں اور جو کچھ ہمیں بننا ہے۔ انسان کی زندگی صرف بحیثیت کل ہی بامعنی ہے۔ کسی ایک وقت میں گزرنے والی حالت کے اعتبار سے نہیں بلکہ جیسی کہ وہ ماورا الوقت سے نظر آتی ہے۔ یہودی راہب بالشم نے بستر مرگ پر کہا تھا مجھے اب سمجھ آئی ہے کہ مجھے کیوں پیدا کیا گیا تھا۔

کسی کی زندگی کا پورا خاکہ تبھی سامنے آتا ہے جب وہ مکمل ہو جائے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسے اہلِ نظر موجود ہیں جو انسان کے ایک فعل کی جھلک دیکھ کر اس کی کل شخصیت کو پہچان لیتے ہیں لیکن ان لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہم جن خصوصیات سے پہچانے جاسکتے ہیں انھیں اکثر خول تلے چھپائے رکھتے ہیں۔ شخصیت کی مکمل پختگی اور انسان کے مکمل اوصاف کا اظہار ہونے میں وقت لگتا ہے اور اس عمل میں پہلے اس کی ادھوری اور بے ڈھنگی شکلیں ابھرتی ہیں پھر آہستہ آہستہ نکھرتی ہیں۔ ہمیں سماج سے جس آزادی کی ضرورت ہے وہ ہے اپنی اصلیت کی نمو اور اس کے تحقق کی آزادی۔ مولانا روم فرماتے ہیں ''اے خالق تو نے کہا ہے کہ چاہے میں تمہارا بھید جانتا ہوں پھر بھی اسے اپنے عمل میں ظاہر کرو''۔ فنکار مادی اشیا میں معانی نہیں ڈالتا بلکہ ان میں مخفی معنویت کو باہر نکالتا ہے۔ انسان سے بھی اپنے محدود ارضی سیاق وسباق میں اپنے ''اسم حقیقی'' کو ظاہر کرنے کو کہا گیا ہے بقول مولانا روم:

لیک گفتی گرچہ می دانم سیرت
زود ہم پیدا کنش بر ظاہرت
حاصل آن آمد حقیقت نام ما
پیش حضرت کآن بود انجام ما

''اگر انسان ایک مرکزی مخلوق ہے، خلیفۃ اللہ ہے جیسا کہ نوع انسانی کے تمام روایتی عقائد بیان کرتے ہیں تو پھر انسان کے منصب خلافت کے فرائض کا آغاز خود آگاہی سے ہوتا ہے۔ لیکن خود آگاہی کے اتنے ہی طریقے ہیں جتنے دنیا میں انسان ہیں۔ اس لیے مارٹن بوبر نے ایک مقولہ نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''ہر شخص یکتا ہے اور اگر اس جیسا کوئی انسان پہلے پیدا ہو چکا ہوتا تو پھر اسے

پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہر شخص دنیا میں ایک نئی چیز ہے اور اسے اپنی انفرادیت کی تکمیل کرنی چاہیے کہ مسیح موعود کی آمد اس تکمیل کے انتظار میں ہے۔"

تخلیق شدہ دنیا اس لیے موجود ہے کہ بعض امکانات ــــ معانی کا ایک مخزن مخفی ــــ جن کا صرف کون و مکان کی حدود میں خارجی اظہار ہوسکتا ہے ظاہر اور پورے کیے جائیں اور تخلیق اس وقت تک ختم نہیں ہوگی جب تک کہنے والی ہر بات کہی نہیں جاسکتی اور کرنے والا ہر کام ہو نہیں جاتا۔

ہماری ذمہ داری یہیں سے شروع ہوتی ہے کہ ہمیں جو اہم ترین چیز یعنی ہماری انفرادیت عطا کی گئی ہے اسے مرکز سے بیرونی سطح تک لائیں۔ لیکن اس نشوونما کا کوئی وقت مقرر نہیں یہ زندگی میں کسی وقت بھی عروج اور تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔

یہاں انفرادیت سے وہ مراد نہیں جو جدید دنیا میں لی جاتی ہے۔ یعنی ایک خود بستہ معمول جس پر مختلف مخالف اشیا عمل کرتی ہیں اور یہ معمول یا شخص خیالات، جذبات، موروثی خواص اور اکتسابی خصوصیات کا ایک مرکب ہے۔ ہم اس وقت تک روایتی تصور انسان کو نہیں سمجھ سکتے جب تک یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ حالات خود بھی اس حد تک ہماری انفرادیت کا حصہ ہیں جہاں تک یہ ہماری تقدیر میں شامل ہیں۔ فاعل یعنی انسان کے وجود کا سب سے اندرونی مرکز اور ماخذ اس کا ذہن، جذبات یا حواس نہیں یہ تو اس کے شعور کے مدرکات ہیں۔ انسان کی ذہنیت، جذباتی مزاج یا جسم اور اس کے خارجی حالات اور ماحول کے درمیان کوئی اساسی تخصیص نہیں ہے۔ یہ سب مل کر ایک بامعنی کل بناتے ہیں اور ایک فرد کی زندگی کے مختلف پہلو ہیں۔

پیدائش سے موت کے درمیان ایک وجود، مادے اور واقعات کے ذریعے وہ نقوش بناتا ہے جنھیں بحیثیت کل اس کے اصل تشخص کا نام دیا جاسکتا ہے۔ انسان جو کچھ کرتا ہے اور جو کچھ اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جو کچھ اس کے احاطے میں آتا ہے سب اس کا حصہ ہے جو ہمارے نزدیک تو وقت اور مقام میں بکھرا ہوا ہے لیکن خدا کے ذہن میں ایک واحد ابدی امر کی طرح ہے۔ اس صورت میں انسان کو ماننا چاہیے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوتا ہے وہ بھی ہماری فطرت کا حصہ ہے اس طرح پھر یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے اندر کسی غصے یا محبت کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے یہ میں ہوں۔ اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھ یا زخمی پاؤں کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے یہ میں ہوں۔ اپنے جیون ساتھی کو یا اپنے لگائے ہوئے باغ کو دیکھتا ہے اور کہتا ہے یہ میں ہوں۔ اپنے دشمن کو دیکھتا ہے اور اپنی موت کو دیکھتا

ہے اور کہتا ہے یہ میں ہوں۔ لیکن یہ کہتے ہوئے بھی وہ اس امر کا شاہد ہے کہ وہ ان سب کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ یہ مشاہدہ اس حقیقت کی پہچان ہے جو ہمیشہ سے ہمارے اندر تھی اور رہے گی۔

اسلام اپنی اعلیٰ ترین سطح پر تسلیم قضا و قدر کا دین ہے۔ ساتھ ہی یہ جہاد فی سبیل اللہ کا دین بھی ہے۔ اس جہاد کے دو پہلو ہیں، جہاد اصغر اور جہاد اکبر یعنی خدا کے دشمنوں سے (جو ماحول کی وحدت کو توڑنا چاہتے ہیں) اور اپنے اندر کے دشمن سے جو ہمارے اندر کی وحدت کو بکھیرنا چاہتا ہے اور موخر الذکر جہاد اول الذکر سے افضل ہے۔

اسلام یہ سکھاتا ہے کہ انسان اپنی تمام تر قوت سے اس چیز کے خلاف لڑے جو اسے شر انگیز، مخالف یا تباہ کن دکھائی دے لیکن یہ کرتے ہوئے قرآن کی یہ ہدایت ہمیشہ ذہن میں رکھے جو مسلمانوں کی گفتگو میں اکثر سننے میں آتی ہے 'واللہ اعلم'۔ خدا بہتر جانتا ہے۔ یہ فطری چیز ہے کہ انسان فیصلے اور امتیاز کی صلاحیت کو استعمال کرے لیکن اس کے نتائج کا ہمیں علم نہیں۔ اگر ہم ناکام رہیں تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس خاص لمحے پر یہی ہمارے لیے بہتر تھا۔ ہم جس طرح ماضی میں دیکھ سکتے ہیں اس طرح مستقبل میں نہیں دیکھ سکتے۔ ہم تو یہاں اس لمحے میں زندہ ہیں اور یہی وقت کی بندش خلافت کی ذمہ داری کی ادائیگی کو ممکن بناتی ہے۔

اس سلسلے میں ایک شکایت یہ ہوتی ہے کہ ہم گویا پہلے سے مقرر شدہ تقدیر پر چل رہے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ مستقبل صرف 'خدا کے ہاتھ' میں ہے یا حقیقت کے حتمی قالب میں خلقی طور پر موجود ہے گویا جو کچھ ہونے والا ہے وہ ''وہاں'' پہلے سے موجود ہے۔ ہمارے نکتہ نظر سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ابھی ''یہاں'' نہیں ہے اور ہم خدا نہیں ہیں۔ ہمارے لیے ابھی وہ وقوع پذیر نہیں ہوا۔ اس لیے ہمارا تشخص وقت اور مقام میں بکھرا ہوا ہے۔ جب ہم اسے اکٹھا کرتے ہیں تو ہم یہاں اور اس وقت اس بات کا تحقق کر رہے ہیں جسے جاننے کا اور کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں۔

چونکہ ہمارے ماحول کا وہ حصہ جس کا ہم سے واسطہ پڑتا ہے ہمارے تشخص ہی کا حصہ ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ خلیفۃ اللہ کے عمل کا میدان اس کی اپنی ذات ہے اور سب سے بڑی جنگ وہ اپنے ہی اندر لڑتا ہے۔

ہمیں اس بات سے آگاہ رہنا چاہیے کہ ہمارا یہ حجرہ ارضی اور اس کے حالات اضافی اور مقامی ہیں اور ہماری فطرت کے دو رخ ہیں۔ ایک وہ جو روزمرہ زندگی کے حالات میں ہماری ذہنیت،

ہمارے جذبات اور ہمارے حواس کے ذریعے حصہ لیتا ہے اور دوسرا وہ جو اس سے بالاتر ہے۔ پرانے وقتوں میں یہ آگہی کسی نہ کسی شکل میں عالمگیر تھی۔ اس کو کھو کر ہم اپاہج ہو گئے ہیں۔

پرانے زمانوں کے لوگ بھی مصائب اور آلام سے گزرتے تھے اور شاید ہم سے زیادہ ہی سہارتے ہوں گے لیکن یہ آلام ہمارے آج کے آلام کی طرح بے معنی نہیں تھے نہ ہی اتنے مایوس کن تھے۔ وہ انھیں قبول کرتے تھے۔ اس قبولیت میں بھی معانی تھے جو اسے روایتی دانش نے عطا کیے تھے۔ جو کچھ ہمارے لیے مجردات ہیں وہ ان کے لیے حقیقت تھی۔ وہ ان آسائشوں اور وقت گزاری کے حیلوں کے بغیر گزارا کر سکتے تھے جو ہماری اذیت ناک حالت کو وقتی طور پر گوارا بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ تب منصبِ خلافت ہر فعل کی بنیاد تھا اور اس طرح وہ دنیا کے معانی کو اپنی روز مرہ زندگی میں شامل کرتے رہتے تھے۔ دنیا میں جو تبدیلی آئی ہے وہ اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ ہم دنیا میں اپنے مقام کا کیا تصور قائم کر بیٹھے ہیں۔ جب خلیفہ ہاتھ سے باگ ڈور چھوڑ دے تو سب کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

باب ششم

ہمارا واحد ورثہ

آج کل مہذب فریب کا دور ہے اس لیے دوسرے تمدنوں کے سلسلے میں مغربی آدمی کے تکبر پر نہایت شائستہ انداز میں ملمع چڑھا لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ موجود بہر حال ہے اور مغربی آدمی اس سے چھٹکارا نہیں پا سکا۔ اس کا اتنا ہی ثبوت کافی ہے کہ تمام غیر یورپین اقوام سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ مغربی طرز حکومت اور بعد از عیسائیت اخلاقیات (جو اقوام متحدہ کے منشور میں موجود ہے)، اپنائیں۔ جو ایشیائی، افریقی اور عرب کسی طرح ہمارے مخصوص کرداری معیاروں سے ہٹتے ہیں ان پر افسوس کیا جاتا ہے۔ یہ رویہ اس اطمینان کا مظہر ہے جو دو عالمی جنگوں کے بعد بھی ختم نہیں ہوا اور جو اس امر کو نظر انداز کر دیتا ہے کہ مغرب کی تاریخ تباہی اور استحصال کی بے مثال داستان ہے۔

اس تکبر اور اطمینان کی بدولت ہم پہلے وقتوں میں یا (اب بھی کہیں کہیں) جو انسانی معیار تھا اسے صحیح انداز میں سمجھ نہیں پاتے اور اس لیے جدید دنیا خود کو صحیح سیاق و سباق میں یا معروضیت کے ساتھ نہیں دیکھ سکتی۔

ادیان کے مشہور مؤرخ مرسیا الیاد کے بقول پچھلے پچاس برس میں مغربی اہل علم نے دیومالا اور اساطیر کو ایک نئے انداز میں دیکھنا شروع کیا ہے جو اس سے بالکل مختلف ہے جو ان کے انیسویں صدی کے پیشرو اختیار کرتے تھے۔ اسے اس طرح قبول کرنا جس طرح وہ قدیم زمانوں میں سمجھی جاتی تھی۔ یعنی ایک سچی کہانی کے طور پر جو کائنات اور اس میں انسان کے مقام کے بارے میں کچھ بتاتی ہو۔

مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ٹیلیوژن کے پنڈت جو لوگوں کی آرا پر کافی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں اور تعلیمی اداروں کے کرتا دھرتا اب بھی اس پرانے رویے پر قائم ہیں اور دیومالا کو قبل از سائنس کے دور کی نامکمل اور بری بھلی کوشش سمجھتے ہیں جو مشاہدے میں آنے والے مظاہر کو سمجھنے کے لیے کی گئی۔ یہی سوچ زیادہ تر عوام کے ذہنوں میں بیٹھ چکی ہے اور وہ پچاس برس پہلے کے سائنسی نظریات پر اپنی آرا کو مبنی کیے بیٹھے ہیں۔

جب سے عیسائیت نے دوسری قدیم اقوام کی عبادتوں اور دیومالا کو غلط طریقے سے سمجھنا شروع کیا تب ہی سے اس کا اپنا اعتقاد بھی ڈانواڈول ہوگیا اور آخر کار عیسائیت کی حیثیت بھی مشاہدے میں آنے والے حقائق کو سمجھنے کی ایک غیر سائنسی کوشش سے زیادہ نہیں رہ گئی۔ بچارے پروٹسٹنٹ فرقے والوں نے تو یہ بھی قبول کرلیا کہ دین ایک ایسا مظہر ہے جو انسانی ''ارتقا'' کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا ہے مگر اس میں سے ''توہمات'' اور ''غیر سائنسی عناصر'' کو نکال دینا پڑے گا اور یہ کہ تمام مذاہب (عیسائیت سمیت) غیر سائنسی دور کی تلچھٹ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ جدید دور کے ساتھ چلنے کے لیے ان بچاروں نے عیسائیت کو نئے سماجی ڈھانچوں میں ڈھالنے کی کوشش بھی کی اور یہ ثابت کرنے لگے کہ مذہب اچھے شہری، اچھے ٹیکس دہندگان اور مہذب ہمسائے پیدا کرسکتا ہے اس لیے اسے باقی رہنے کا حق دے دیا جائے۔ اب حال ہی میں کیتھولک فرقہ بھی اسی غلطی میں مبتلا ہوگیا ہے۔ لیکن جس قدر یہ پیچھے ہٹتے ہیں (یا پسپا ہوتے ہیں) اسی قدر ان کے دشمن ان پر چڑھتے آتے ہیں۔

درحقیقت اصل سوال صرف ایک ہے۔ کیا دین برحق ہے یا باطل ہے؟ اس سوال کے جواب میں کسی اخلاقی یا سماجی لحاظِ مروّت کی ضرورت نہیں۔ اگر دین حق ہے تو پھر کچھ مزید کہنے کی ضرورت نہیں۔ پھر یہ اچھے شہری پیدا کرے یا نہ کرے، یہ غیر متعلق بات ہے اور اگر یہ باطل ہے، ڈھونگ ہے تو پھر چاہے یہ دنیا کو کتنا ہی آرام دہ بنادے، باطل ہی رہے گا۔ یہ سادہ سوال تمام ملحوظات سے بالاتر ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہم اس کا جو بھی جواب دیتے ہیں وہی ہمارے باقی تمام سوالات کے جوابات فراہم کرتا ہے۔ یہ جواب اگر مثبت ہے تو مکمل طور پر مثبت ہے اور اگر نفی میں ہے تو مکمل طور پر منفی ہے۔

کئی دفعہ زہر اور تریاق ایک ہی چیز میں موجود ہوتے ہیں۔ مختلف تمدنوں اور مذاہب کو الگ الگ دنیاؤں میں تقسیم کرنے والی حد بندیوں کے ٹوٹنے سے جو پراگندگی پھیلی ہے اس خرابی میں تعمیر کی ایک صورت بھی مضمر ہے۔ اب ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ مختلف تناظر آپس میں درحقیقت متصادم نہیں ہیں بلکہ ان کا رُخ ایک ہی مرکز کی طرف ہے۔ مختلف روایتیں اور مذاہب حق تک لے جانے والے مختلف قسم کے پل ہیں۔ بہت سے لوگوں کے لیے ایک پل کافی ہوسکتا ہے لیکن انھیں پہلے اس کی مضبوطی پر پختہ اعتقاد رکھنا ہوگا۔ اس اعتقاد کے لیے پلوں کی فطرت کے بارے میں ایک عمومی علم کی ضرورت ہے اور یہ تبھی مؤثر ہوسکتا ہے جب ہم اس قدیمی روایت یا دانش قدیم کو

بھی جانیں اور سمجھیں جو انسانی ورثہ ہے اور جس سے تمام مذاہب کے پل بنے ہیں۔ اس کی بنیاد پر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور اس وقت کس حال میں ہیں؟ وقت کے ساتھ ساتھ زوال پذیر انسانیت کی اشد ضرورتوں کے مطابق مشیتِ الٰہی کے تحت اس دانش کا تطابق ہوتا رہا اور تمام مذاہب اس طرح وجود میں آئے۔ ایک خاص دور میں اس انداز کا مذہب بھیجا گیا جس کی اس دور میں انسانیت کو ضرورت تھی لیکن اس طرح آنے والے تمام مذاہب صرف ظاہری شکل میں مختلف تھے ان کی بنیاد اس ایک دانش پر تھی۔

اس طرح ہر نئی آنے والی وحی بیمار انسانیت کے لیے دوا بن کر آئی ایسے وقتوں میں جب انسان اپنی اصلیت اور اپنی منزل سے بے خبر ہو چکا تھا۔ اس طرح ہر نئی وحی پچھلی وحی سے مربوط رہی اور آخری وحی یعنی اسلام جو کہ ایک روحانی خلا کے عالم میں اتری پھر بھی یہ بات واضح ہے کہ رسول مقبول ﷺ نے کوئی نئی وضع نہیں نکالی بلکہ گم گشتہ حقیقتوں کی یاد دلائی اور ایک دانش قدیم کو بحال کیا اور اس طرح انسانیت کے عالمگیر دین کی طرف پہنچنے کا راستہ ہموار کر کے ان تمام انبیا کے کام کو مکمل کر دیا جو ابتدائے آفرینش سے رب اور بندے کے درمیان تعلق کو قائم رکھے ہوئے تھے۔

سلسلۂ وحی کے احیا کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ انسان وقت کے دھارے کے برخلاف تیر کر اپنی قدیم اور اصلی روایت تک نہیں پہنچ سکتا۔ فطرت کے قانون میں وقت کا رخ اوپر سے نیچے کی طرف یعنی انحطاط کی طرف ہے۔ وحی کا احیا کچھ عرصے کے لیے اس عمل کو روک دیتا ہے لیکن مستقل ایسا ہونا ناممکن ہے۔ وحی کا برق آسا اثر بہت سے برگشتہ ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک مربوط نقش بنا دیتا ہے جس کے ذریعے ہستی کے چہرے پر کوئی پیغام یا معانی ابھرتے ہیں لیکن ان نقش کو بھی وقت کے طبعی عمل سے گزرنا ہوتا ہے اور ان کی بھی وہی تقدیر ہے جو تمام اشیا کی تقدیر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے اصل اندوختے اور ورثے تک پوری طرح پہنچ نہیں پاتے بلکہ صرف ان ذروں، ٹکڑوں، بازگشت اور یادوں میں اس کی جھلک دیکھتے ہیں جو ہمارے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں اگر ہمارے پاس دیکھنے والی آنکھ ہو تو..... یہ ٹکڑے اب بھی قدیم اقوام کی دیومالا اور عبادات میں نظر آجاتے ہیں اور چاہے وہ ان کا اصل مطلب بھول ہی کیوں نہ چکے ہیں، بہرحال موجود تو ہیں اور یہ بھی بہت غنیمت ہے۔ وہ نہایت انمول ہیں اس لیے کہ ہماری خلافت کے تشخص کی تصدیق کرتے ہیں۔

سامی مذاہب اور بدھ مت وغیرہ کو تاریخ اور وقت کے پس منظر میں دیکھا جاسکتا ہے کہ وہ تاریخ میں ایک مظہری صورت میں ابھرے اور فروغ پایا۔ لیکن بہت قدیم عقائد کی کوئی تاریخ نہیں۔ وہ تو ابدیت کا نقشہ ہیں اور ان کے لیے وقت کم از کم داخلی طور پر ٹھہر گیا ہے۔ وہ تو ایسی چٹانیں ہیں جو وقت کے ساتھ تہ آب چلی جائیں۔

قدیم اور ابتدائی دور کے لوگوں کے لیے تاریخ اور دیومالائی اساطیر دو الگ چیزیں تھیں بلکہ تاریخ میں وہی کچھ وقوع پذیر ہوتا تھا جو وقت سے پہلے، کون و مکاں سے قبل دیومالا میں ہو چکا تھا۔ ذاتی زندگی میں بھی اور عالمی واقعات کے وسیع سیاق میں بھی، قدیم انسان اسی چیز کو حقیقی سمجھتا تھا جو ایک پہلے سے موجود، ہم آہنگ سانچے میں پوری اتر سکے۔ کھیتی باڑی یا شکار کے کچھ خاص طریقے تھے، کھانے پینے، محبت کرنے اور اشیا ساخت کرنے کے کچھ اصول تھے۔ انسان وہ کرنا چاہتا تھا جو دیوتاؤں نے زمانۂ وقت کے آغاز سے پہلے کیا تھا۔ اس کے علاوہ اور تمام طریقے بے ہنگم اور بنجر ہیں۔ وہ حق کے لیے بے تاب رہتا تھا اور یہ سوچتا تھا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پڑ کر وہ خود بھی بے مصرف ہو جائے گا اور اپنی خلافت اور اپنا وقار کھو بیٹھے گا۔ آج کے حالات میں وہ اپنے ماخذ سے اتنا دور ہو چکا ہے کہ کوشش سے پہلے ہی شکست خوردہ ہوتا ہے اور وقت کا دھارا اب اتنی تندی سے رواں ہے کہ اس بھولے بسرے عہد کی بازگشت اس تک نہایت مدہم ہو کر پہنچتی ہے۔ پھر بھی قدیم آدمی ایک نشانی، ایک یاد ہے جس سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔

قدیم آدمی جسے ہم دقیانوسی کہتے ہیں اس دور کی باقیات میں سے ہے جب انسانی زندگی کے حالات اب سے بہت مختلف تھے اس لیے اس کے لیے بیماری، بنجر پن، یا حادثاتی موت وغیرہ کو جو ہمیں قطعاً پراسرار نہیں لگتے، فطری مصائب کے طور پر قبول کرنا مشکل تھا۔ اس کے نزدیک یہ سب طبعی تنظیم اور ہم آہنگی میں ایک رخنے کی طرح ہیں کیونکہ وہ تھوڑی بہت مدہم سی اس دور کی یاد ضرور رکھتا ہے جب اس قسم کی مصیبتیں انسانیت کے لیے عام نہیں ہوئی تھیں۔

یہ دقیانوسی شخص چونکہ اب تک دنیا میں مطمئن ہے اور ماحول پر بھروسہ کرتا ہے اس لیے وہ ان مصائب کی ذمہ داری جن سے اس کا واسطہ پڑتا ہے خود پر یا دوسرے لوگوں پر رکھتا ہے۔ وہ فطرت کے زیرو بم میں وقت کے گزرنے کی چاپ نہیں سنتا۔ اس کے لیے حقیقت قدیم ہے اور ازلی ہے اور وہ خود اور اس کی زندگی اس حقیقت کے پہلو ہیں۔

قدیم آدمی کے ہاں وقت کا تصور اس لیے بھی مختلف ہے کہ وہ زندگی میں بہت سے موقعوں پر بہت سی ایسی رسوم سے گزرتا ہے جب اسے ماضی سے ایک دم کٹ کر ایک نئے مرحلے میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ ہمارے لیے صرف جسمانی موت کا مہیب مظہر ہی ایسا موقع فراہم کرتا ہے جبکہ قدیم شخص کی زندگی میں موت اور دوبارہ جنم لینے کے کئی مواقع ہیں جب وہ پچھلے کردار میں مر کر ایک نئے کردار میں جنم لیتا ہے۔ نام رکھنے کی رسوم، بلوغت، شادی اور ایسی ہی بہت سی رسوم، اسے ماضی سے ہٹا کر ایک نئے مرحلے میں داخل کر دیتی ہیں جہاں وہ نئے تشخص کے ساتھ ابھرتا تھا۔ اس صورت میں جسمانی موت میں اس کے لیے وہ انوکھا پن نہیں ہوگا جو ہمارے لیے ہے۔ وہ تو محض بہت سی عظیم انقلابی رسوم سفر میں سے ہے۔ اسے بعد از موت کی زندگی کے بارے میں بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ ہر اختتام کو ایک نئے آغاز کی تمہید سمجھتا ہے۔

ایک با ربط دنیا میں رہنے کے سبب اور بے معنویت کے اس احساس سے آزاد ہونے کے باعث جو وقت اور کثرت کو حتمی سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے اس آدمی کو وہ سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں جو ہم پوچھتے ہیں اور نہ ہی معانی کی تلاش کی حاجت..... کہ اس کے لیے تو حسیاتی اشیا اور انسانی زندگی کے عام واقعات سب اس معانی میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ تمام روایتی عقائد میں چاہے وہ بظاہر مختلف ہی کیوں نہ ہوں، یہ خیال مشترک ہے کہ انسان کو اپنے دنیاوی ماحول سے عہدہ برا کرنے کے لیے نہ صرف ذہنی، جذباتی اور حسیاتی آلات فراہم کیے گئے ہیں بلکہ تمام حقیقی سوالات کے جواب بھی، جس سوال کا جواب نہیں ملتا وہ یقیناً صحیح انداز میں پوچھا نہیں جا رہا۔

لیکن جب سوال پوچھنے والا ذہن باقی شخصیت سے بحیثیت کل الگ ہو جائے اور صرف اپنے مخصوص حوالے سے ہر چیز کو سمجھنا چاہے تو پھر ان جوابات سے تسکین نہیں ہوتی کہ یہ تو انسان کی کلی حقیقت سے وابستہ ہیں اس کے وجود کی کسی بھی سطح پر تقسیم، خلل، ابہام یا کذب واقع ہونے سے مکمل تفہیم میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے کہ کل ہی کل کو سمجھ سکتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: ''آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ یہ دل ہیں جو نابینا ہو جاتے ہیں۔''

انسانی تفہیم کو دو چیزیں محدود کرتی ہیں ایک تو مخصوص تربیت کی کمی یا کسی مخصوص علم سے ناواقفیت اور دوسرا کسی موضوع کو گرفت میں لانے کی عملی استعداد ــــ کسی سچائی کو نہ سمجھ پانے میں

ہماری قلتِ استعداد کا دخل بھی ہوسکتا ہے لیکن ہم یہ تسلیم نہیں کرتے اور یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جو کچھ ہماری سمجھ سے باہر ہے وہ بیکار ہے یا وجود ہی نہیں رکھتا۔ یہ رویہ قدیم اقوام کے علامتی نظریات اور دینی کتابوں دونوں کے بارے میں آج کل روا رکھا جاتا ہے اور اس سلسلے میں جیکا کی وہ ضرب المثل بالکل درست بیٹھتی ہے کہ جو بیوقوف شخص خود کو ذہین سمجھتا ہے وہ ''اتنا جاہل ہے کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ نہیں جانتا''..... جو علامتی اور استعاراتی انداز فکر پرانے لوگوں کے لیے فطری تھا اسے ہم ارتقائی معنوں میں دقیانوسی کہہ دیتے ہیں اور منطق سے پہلے کی سوچ رکھنے والوں کو عقل کے بھرپور استعمال کے قابل نہیں سمجھتے لیکن اس بات کو ایک اور رخ سے بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ آج ہم چونکہ علامت اور استعارے کی ترکیبیں اور ٹھوس اصطلاحات میں سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں اس لیے ان علامات کو عقلی تصورات اور بنیادی عقائد میں تبدیل کر کے سمجھنا پڑتا ہے۔ گویا ارتقا کی بجائے ہماری حقیقت کو سمجھنے کی استعداد الٹا کمزور پڑ گئی ہے۔ اب حقیقت کو بحیثیت کمال، اس کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے اور اس کی فوق العقل رنگا رنگی اور معنویت میں سمجھنا روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ قدیم آدمی نہیں بلکہ ہم خود عقل کے بھرپور استعمال کے قابل نہیں رہے۔

علامت کو واضح کر کے بحث اور دلیل کے طرز پر بیان کرنے سے نہ صرف اس کی معنویت کبھی بھی پوری طرح بیان نہیں ہو پاتی بلکہ وضاحت میں بھی کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ انسانی زبان کی سخت حدود کے اندر اسے بیان کرنے میں الٹا اس کے معانی کافی حد تک زائل ہو جاتے ہیں۔ ہمارے دور میں ایک علامت اور اس کے مختلف معانی سمجھانے کے لیے عالموں کو پوری کی پوری کتاب لکھنی پڑتی ہے۔ ''اور اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سارے سمندر روشنائی تب بھی خدا کے الفاظ ختم نہیں ہو سکتے۔''[1]

علامتیں بھی اشیا کی مانند ہوتی ہیں۔ ہم انھیں تبھی سمجھ سکتے ہیں اگر اپنے ماحول کے عناصر کو ان کی اصل صورت میں پہچان سکیں یعنی ان کے اصل معانی کا اندازہ لگا سکیں۔ شوآں کا کہنا ہے کہ بنیادی صداقت یہ ہے کہ ''ہر چیز، ہر توانائی اپنے وجود کے اعتبار سے حق کی طرف کھلنے والے ایک

۱۔ شوآں..... روح کی تشبیہات۔ صفحہ ۱۰۰

در کی مانند ہے۔"[1] جس طرح آہستہ آہستہ ماحول منجمد ہوتا ہے یا اپنی شفاف خصوصیت کھو دیتا ہے اور پھر محض استعمال کی چیز یا راستے میں آنے والی رکاوٹ بن کر رہ جاتا ہے اسی طرح رفتہ رفتہ علامت بھی اپنے معانی سے محروم ہو جاتی ہے اور آخر میں محض شاعرانہ تمثیل یا قدیم سائنس بن کر رہ جاتی ہے۔ جدید شخص صرف حسیات کے تجربے میں آنے والی اشیا کو حقیقی سمجھتا ہے جبکہ قدیم آدمی کے لیے حقیقت کسی شے میں نہیں بلکہ اس کی معنویت میں مضمر تھی۔ اس معنویت کو نکال دیں تو وہ چیز ایک سایہ بن جاتی ہے جس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہو۔

ہم اس نکتہ نظر کو صحیح یا غلط سمجھنے کے لیے بالکل آزاد ہیں لیکن اگر ہم اسے بلا پرکھے اور بلا غور کیے رد کر دیں تو یہ انتہائی حماقت ہوگی۔ آخر کو یہ ہمارا واحد ورثہ ہے۔ ہمارے انسانی ماضی کے پاس ہمیں دینے کو اور کچھ بھی نہیں اور اس سے پہلے کہ ہم اس کو ترک کر کے بالکل قلاش ہو جائیں (اس امید خام میں کہ شاید سائنس ہمیں مالا مال کر دے گی) ہمیں پاسکل کی اس بات پر غور کر لینا چاہیے کہ ایک شخص جو کسی بڑی جائیداد اور ترکے کا وارث ہو، کیا اپنے القاب کو بلا تجزیہ جھوٹے یا جعلی کہ کر چھوڑ دے گا؟ حماقت کا سبب صرف بے عقلی نہیں گھمنڈ بھی ہو سکتا ہے کہ تکبر انسان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیتا ہے۔ اگر تمام تر تاریخ نری بکواس ہے اور ہمارا ماضی جہالت اور توہم پرستی کی داستان تو پھر شاید ہم عظیم ہونے کا دعویٰ کر سکیں۔ لیکن اگر ہم ایسے انسان کے وارث ہیں جو ہم سے زیادہ اشرف اور افضل تھا اور ہم سے زیادہ جانتا تھا تو پھر ہم نرے بالشتیے ہیں اور ہمارے سر شرم سے جھک جانے چاہئیں۔

محض معلومات کی خاطر معلومات اکٹھی کرنے یا حقائق کا علم حاصل کرنے میں کوئی خوبی نہیں۔ یہ تو اسی طرح ہے جیسے آوارہ کتے بیکار ہڈیاں اکٹھی کرتے ہیں۔ ایک دفعہ اگر انسان اپنی روحانی اور جسمانی ضروریات کے لیے درکار علم کے علاوہ بھی علم اکٹھا کرتا پھرے تو پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس علم کو محدود تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی بجائے اس کے مقابلے میں ایسی صداقتوں کا علم رکھا جائے جو ان ہڈیوں کو ان کے اصل سیاق میں ظاہر کر دیں۔

یہ بات دوسری قوموں یا تہذیبوں کے بارے میں علم حاصل کرنے سے پہلے ذہن میں رکھنی چاہیے۔ آسٹریلیا کے کسی قبیلے یا کسی قدیم قوم کے بارے میں علم اکٹھا کرنے سے جدید یورپ یا

۱۔ شوآں..... روح کی تشبیہات۔ صفحہ ۱۰۰

امریکہ کے باشندوں کو کیا فائدہ ہوگا؟ سوائے اس کے کہ ہم اس پر تعجب کریں اور ان کے تمدن کا مضحکہ اڑائیں۔ اگر اس قسم کا علم حاصل کرنا ہے تو پھر اسے جذب کرنے کے لیے اپنی وسعت نظر میں اضافہ بھی کرنا ہوگا۔

ابتدائی دور کے عیسائی کو اس بات سے کوئی واسطہ نہیں تھا کہ خدا کا پیغام کتنی مختلف زبانوں اور انداز میں انسان تک پہنچا ہے۔ وہ ایک دینی سیاق میں بالکل محفوظ اور مستحکم تھا جو اس کی اصل ضرورتوں کو پورا کرتا اس کے سوالوں کے جواب مہیا کرتا اور اس کو ابدیت تک پہنچنے کے لیے پل مہیا کرتا تھا۔ اس کی نجات کے لیے یہ کافی تھا۔

اسے تو صرف خدا تک اپنا راستہ بنانا اور اسے مضبوط کرنا تھا اور اس کام کے لیے اس کے پاس عقائد اور عبادات کے مناسب سہارے موجود تھے۔ دوسرے عقائد یا دوسرے تمدن کے لوگ اس کام کے لیے کس قسم کے ذرائع استعمال کرتے تھے۔ یہ اس کے لیے بے معنی تھا اور وہ اگر دوسرے تمدنوں کو غلط سمجھتا تھا تو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ یہ تو جب جغرافیائی حد بندیاں ٹوٹیں اور یورپین (جو پہلے عیسائی تھے پھر سابقہ عیسائی ہوگئے) پورے کرہ ارض پر پھیل گئے تب صورت حال بالکل بدل گئی۔

اگر کوئی شخص بے خبری میں مگر دیانت سے اپنے عقیدہ کے دفاع میں کسی دوسری روایت پر حملہ کرتا ہے تو اس کو کوئی دوش نہیں دیا جاسکتا۔ ''لیکن اگر معاملہ یہ نہ ہو تو پھر وہ شخص حق کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا ہے کہ اس نے بہرحال حق کی ایک شکل کی بے ادبی کی ہے۔ کئی لوگ مذہبی اعتقاد کے نام پر اپنی زندگیاں اسی کام پر لگا دیتے ہیں کہ مقدس اور الوہی چیزوں کو بدنما ثابت کریں۔ ان میں ایک خاص قسم کا ان گھڑ اور ناخالص جوش پایا جاتا ہے۔[1] بعض عیسائی مشنریوں کی کاوشوں کا جائزہ لیں تو وہ اس بیان پر پورے اترتے ہیں۔ بعد میں یہی جوش ترقی کے نقلی مذہب کی خدمت میں استعمال ہونے لگا۔

جب تک کوئی دین اپنی دنیا کے اندر محدود اور محفوظ رہتا ہے (چاہے یہ دنیا جغرافیائی سرحدوں سے بنی ہو یا نسلی عوامل کی بنا پر) تو وہ دلائل اور عقائد جن پر اس کی اکثریت ایمان رکھتی ہے، بڑی حد تک مقامی رہتے ہیں۔ ان کی تنگنائی یا جدید علم کی طرف سے ہونے والی تنقید کے سامنے ان کی

۱- مذاہب کی ماورائی وحدت۔ صفحہ ۲۸

پسپائی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی جب تک وہ مؤثر ہیں، بالالفاظ دیگر کائناتی اور عالمگیر حقیقت کی طرف ایک جھروکہ کھولتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب وہ حقیقت کو صحیح طرح پیش کرتے ہوں اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ یہ پیش کش بہت دقیق، لطیف یا جامع ہو۔ صرف اتنا ضروری ہے کہ وہ انسان کے وجود کے مرکز میں جو کچھ موجود ہے اسے بیدار کردے یعنی اس کے قلب کو رحمت کے لیے کھول دے۔

مذہبی اصول ان لوگوں کا بہت نشانہ بنتے ہیں جو انھیں ایک فراموش کردہ مگر قابل حصول علم تک پہنچنے کا زینہ سمجھنے کی بجائے ان کا تجزیہ اور معائنہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اصولی عقائد دراصل صرف یادداشت کے ممد ومعاون ہیں اور کچھ نہیں۔ وہ کوئی سائنسی کلیہ نہیں نہ ہی انھیں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے جیسے سیاروں کی حرکت یا بلور کی ساخت کے قوانین بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں ہمارے مرتبہ وجود سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ مذہبی اصول جن صداقتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں انھیں کسی صورت اضافی سطح پر نہیں لایا جاسکتا۔ وہ تو ہم تک اشاروں کی شکل میں پہنچے ہیں اور روح کے لیے گویا ایک چارہ ہیں جو ابھی تک چمکدار گہرائیوں میں پوری طرح غرقاب نہیں ہوئی۔ ہمیں ان اصولوں کی اساسی کلیت تک خود پہنچنا ہے اور یہ یقین کہ ہم وہاں پہنچ سکتے ہیں دراصل تمام مذاہب اور قدیمی عقائد کے بنیادی تیقنات میں سے ہے اور اس پر ان کے قصر تعمیر ہوئے ہیں۔ جب یہ یقین نظر سے اوجھل ہوجائے اور قصر کے سب سے اندرونی کمرے پر قفل پڑ جائے تو دین کا مقصد حیات ختم ہوجاتا ہے اور وہ انحطاط کا شکار ہونے لگتا ہے۔

ہم شاید سچ مچ اس یقین کو نظروں سے اوجھل کر بیٹھے ہیں۔ یہ صدیوں کے ملبے تلے دب جاتا ہے۔ لیکن اندرونی کمرہ تو موجود ہے اور اس کا قفل کھل بھی سکتا ہے گو کنجی ذرا زنگ آلود ہوگی۔ رحمت کا وہ خزانہ جو ہر وحی کا روشن مرکز ہے، ابدی ہے اور فانی اشیا پر اثر انداز ہونے والے انحطاط کے عمل سے ماورا ہے۔ رب کائنات پیچھے نہیں ہٹتا، ہم ہی منہ موڑ کر چلے جاتے ہیں۔

اور جب ہم منہ موڑ لیتے ہیں تو پھر نئے سرے سے کسی نئے مذہب کی شکل میں وحی اترتی ہے۔ یہ گم گشتہ جنت تو واپس نہیں دلاتی لیکن ایک حد تک انسان کے اندر اور اس کے ماحول میں وہ روحانی توازن بحال کردیتی ہے جو عہد اوّلین میں موجود تھا۔ یہ لمحے معجزے سے کم نہیں اور معجزے روز روز نہیں ہوتے۔

ادیان تو وقت کے دھارے میں کشتی کی مانند ہوتے ہیں جو انسان کو نجات کے ساحل تک پہنچا دیتے ہیں۔ انسان کو کثرت میں مبتلا ہونے، بکھرنے اور منتشر ہونے سے بچانا ہے کہ اس عمل میں وہ بحیثیت انسان اپنا اصل تشخص کھو بیٹھتا ہے۔ ہر دین اپنے ماننے والوں پر جو وحدت نافذ کرتا ہے وہ یقیناً کسی حد تک ظاہری صورتوں میں بے لوچ ہوتی ہے لیکن یہ اس کشتی کی مضبوطی کے لیے ضروری ہے۔ یہ اعتراض نہایت بچگانہ ہے کہ جو چیز ایک مذہب منع کرتا ہے اس کی دوسرا مذہب اجازت دے دیتا ہے اور جنسی قواعد کے جواز پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سیاق میں بالکل درست ہیں اور اس کشتی کے حصوں کی مانند ہیں جو کسی ایک دینی تناظر کی روشنی میں بنائی گئی ہے۔

ہمارے عہد میں جو لوگ یہ تقاضا کرتے ہیں کہ ان کو ''اپنے انداز میں'' خدا تک پہنچنے کا حق حاصل ہونا چاہیے اور تمام منظم ادیان کو رد کرتے ہیں وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ اگر بفرضِ محال وہ یہ راستہ استعمال کرنے کے قابل ہیں بھی (فطری طور پر چند ایک لوگ اس قابل ہو سکتے ہیں) تو کیا وہ دوسرے لوگوں سے اس کشتی کا سہارا چھین کر انھیں غرق ہونے کے لیے چھوڑ دینا چاہتے ہیں؟ ان لوگوں کا کیا بنے گا جو یہ استعداد نہیں رکھتے کہ مذہب کے بنے بنائے ڈھانچے کے بغیر حق تک پہنچ سکیں؟ کلیسا اور معبد ضروری ہیں اس لیے کہ خدا کو ان کے بغیر پہچانا نہیں جا سکتا بلکہ اس لیے کہ ہم ان کے بغیر خالق کو نہیں پہچان سکتے۔ وہ تو ہر جگہ موجود ہے لیکن جہاں کسی دین کی ترکیز ہو وہاں آسانی سے اس تک پہنچا جا سکتا ہے گویا لالٹین کی چمنی نے اس کی رحمت کی شعاعوں کو ایک جگہ مرکوز کر دیا ہو۔

جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا قدیم آدمی کی زندگی زیادہ تر اس کے دینی سیاق میں ہی بسر ہوتی تھی اور وہ دینی اقلیم میں اس طرح محو تھا کہ اسے دنیوی کے وجود کا علم ہی نہیں تھا۔ لیکن جدید دور میں مختلف مذاہب کو دینی اور دنیاوی کشمکش سے گزرنا پڑا ہے۔ ان میں سب سے نمایاں عیسائیت ہے۔ عیسائیت میں اسلام یا ہندومت کی طرح سماجی سطح پر مقرر شدہ قواعد و ضوابط موجود نہیں اس لیے اسے یہ ضوابط اور اسلوب اس دور کی دوسری تہذیبوں یعنی عبرانی اور رومی تہذیبوں سے مستعار لینے پڑے۔ اسی لیے عیسائیت میں شروع سے دنیاوی اور دینی کا امتیاز موجود ہے اور وہ یہ تسلیم کرتی ہے کہ انسانی زندگی کے کچھ پہلو دین کے براہ راست احاطۂ عمل سے باہر ہیں۔ ہمارے جدید عہد میں جو دین کو ذاتی معاملہ سمجھنے کا رویہ نمودار ہوا ہے وہ دراصل اسی راستے سے آیا ہے۔

ذاتی ایمان اور مذہب دو مختلف چیزیں ہیں۔ دونوں کے درمیان قریبی تعلق ہے لیکن ان میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ ایک آدمی اپنے سماجی اور معاشی ماحول سے الگ ہوکر بھی ایک روحانی راستے پر چل سکتا ہے۔ لیکن مذہب وہ طاقت ہے جس کے ذریعے تمام جمعیت کو ایک روحانی طور پر متعین شدہ طرز حیات کا حصہ بنایا جاسکتا ہے تاکہ صرف ایک نہیں بلکہ تمام آدمی اپنے تمام افعال کے ذریعے اپنی روزمرہ زندگیوں میں اپنے مقصد حیات تک پہنچ سکیں۔ یہ کشتی تو نوح کی کشتی کی مانند ہے جس میں تمام ضروریات زندگی موجود ہیں۔

زندگی کی باقی چیزوں کو دین سے الگ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ مختلف اشیا اس کشتی سے ٹوٹ کر اپنی الگ کشتیاں بنانے لگتی ہیں۔ لیکن یہ کشتیاں وقت کے دھارے کو پار نہیں کرتیں بلکہ اس کے ساتھ نیچے کی طرف بہتی ہیں۔ سیاست، سائنس، صنعت وحرفت، فنون، ادب سب فخر کے ساتھ اپنے اپنے راستے پر چل نکلتے ہیں اور اپنی ہردم بڑھتی رفتار اور اپنے حالیہ وجود کے علاوہ اور ہر طرف سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ حتیٰ کہ پھر ایک چھوٹی سی آزاد کشتی بھی ان کے ساتھ بہنے لگتی ہے جس پر لکھا ہوتا ہے ''ہمارے دور کی ضرورتوں سے ہم آہنگ مذہب''..... اس کشتی پر ذاتی زندگی گزارنے کے چند ضوابط ہوتے ہیں اور نظریات کا سامان۔ لیکن پتہ نہیں کیوں یہ کشتی باقی کشتیوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ شاید کوئی پرانی یاد اسے پیچھے کی طرف کھینچتی رہتی ہے یا شاید اس کے سامان کی انوکھی نوعیت اسے دوسری کشتیوں سے الگ کرتی ہے۔

دین کو وقت کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی مخالفت کرتے ہوئے ہم شخصی دینداری کی اصل قدر و قیمت کو کم نہیں کر رہے۔ قابل اعتراض بات تو یہ ہے کہ آخر صداقت کو مغالطے کے قریب لانے کے لیے اس کی شکل بگاڑنا کہاں تک مناسب ہے؟ اور نظریۂ ارتقا کا فانی دنیا کے قالب میں کندہ ابدیت کے نقوش پر اطلاق کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ اگر خدا کو جدید دنیا سے خطاب کرنا ہو تو وہ کسی نہ کسی طریقے سے کرسکتا ہے۔ حرف ربانی کی ایک ایسی زبان میں تشریح کرنا جس میں سے موزوں الفاظ غائب ہوچکے ہوں، کس حد تک ممکن ہے؟ اگر لوگ اس مرکزی جگہ سے دور نکل چکے ہوں جو ان کا اصل گھر ہے تو خیر خواہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ انھیں واپسی کا راستہ دکھایا جائے۔ یہ خیال کرنا کہ وہ تو وہیں رہیں جہاں ہیں اور مرکز کو ان تک لے جایا جائے حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟

دین کو بدل کر اور توڑ مروڑ کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول بنانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ عیسائیت میں خاص طور پر پروٹسنٹ فرقے میں اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ عیسائیت محض ایک اخلاقی اور نظریاتی معاملہ بن کر رہ گئی ہے..... مگر بنیادی طور پر دو متضاد عوامل ہیں جو دین کو کمزور کرتے ہیں۔

اوّل تو یہ کہ ہم یہ ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ ہماری جدید دنیا کا ڈھانچہ اس قدر دنیوی ہے کہ اس میں دین کی گنجائش موجود نہیں۔ جدید دنیا کے ہر قول و فعل میں یہ مفروضہ کام کرتا ہے کہ اس دنیا کے علاوہ اور کوئی عالم موجود نہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ دین کے بارے میں بے تعلق رویے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ دین کو خارج کرنے کا مطلب اسے رد کرنا ہے اس لیے کہ دین اسی دعویٰ پر قائم ہوتا ہے، کہ آسمانی صداقت کو ہستی کے کسی بھی کونے سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ اصل ہمیشہ کم اصل پر حاوی ہوتا ہے۔ اس اثر سے بچنے کے لیے کم اصل کو یہ ماننے سے انکار کرنا پڑتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی اصلیت موجود ہے۔ خواب دیکھنے والے کا خواب کس طرح قائم رہ سکتا ہے اگر وہ یہ مان لے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ تو تبھی قائم رہے گا اگر وہ آنکھیں بند رکھے اور جاگنے سے انکار کردے۔

دوسری طرف پروٹسنٹ فرقے نے دین کو ''عام'' لوگوں کے لیے دلکش بنانے کی خاطر عیسائیت کو اس کے مابعد الطبیعیاتی اور عقلی ورثے سے محروم کردیا ہے اور اب تو کیتھولک بھی ان کے نقش قدم پر چل نکلے ہیں۔ یہ ''عام'' لوگ عقلی ملحوضات کی اتنی پرواہ نہیں کرتے لیکن جن لوگوں کی یہ پیروی کرتے ہیں اور جو ان کی سوچ پر اثر انداز ہوتے ہیں وہ ان ملحوظات پر بہت توجہ دیتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ جس اکثریت کی خاطر عیسائیت کو بگاڑا گیا اس نے اس دھلے دھلائے مذہب کو قبول کرنے کی بجائے رہنمائی کے لیے انٹلکچوئل اقلیت سے رجوع کیا اور اس اقلیت نے ایک ہی نظر دیکھنے کے بعد اس پھوک کو رد کردیا ہے۔

لیکن ایسا طبقۂ خواص بہرحال بھی موجود ہیں جو دین کے مابعد الطبیعیاتی سوتے کی تلاش میں نکلا اور صداقت کا قائل ہوگیا اور ایسے بھی جو ایمان کی سادگی میں اللہ جل شانہ کے سامنے جھک گئے اور انھیں مسرت مل گئی۔ لیکن آج کل وسیع تر ذرائع ابلاغ کے دور میں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور وہ مذہبی ڈھانچہ جو رائے عامہ کے سرخیلوں کو نہیں بھاتا وہ جلد ہی عوام میں بھی بے اثر

ہو جائے گا۔ ہمارے دور میں دینی عقائد اور دینی علامات کے سلسلے میں پڑھا لکھا طبقہ جس شدید جہالت کا مظاہرہ کرتا ہے اس سے یہ لگتا ہے جیسے انھیں کبھی دین کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا گیا جتنا کہ سادہ لوح عیسائی مشنری ''وحشیوں'' کو عیسائی کرتے وقت بتاتے تھے۔ انھوں نے دین کو رد نہیں کیا وہ تو دین کے بارے میں جانتے ہی نہیں۔

جب کسی دین کی مابعد الطبیعیاتی اور باطنی (متصوفانہ) جہات بھلا دی جائیں تو پھر وہ گھٹیا سائنسی نقطۂ نظر کے رحم و کرم پر رہ جاتا ہے۔ گو مسلمان اس ارشادِ ربانی سے واقف ہیں کہ ''میرا رحم میرے قہر پر حاوی ہے'' لیکن انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ بے پایاں رحم کے سامنے قہر غائب ہی ہو جائے گا۔ جبکہ عیسائیت ایک ایسی صورت حال میں آ پھنسی ہے جہاں خدا کو بہترین انسانی صفات کی تجسیم کے حوالے سے پیش کیا جاتا ہے۔ وہ قادر مطلق اور خدائے لم یزل نہیں بلکہ ایک غیر مؤثر دیوتا ہے جس میں انسانی خوبیاں اور کمزوریاں موجود ہیں۔ ہم نے قادر مطلق کو انسانی قدبت میں گھڑ لیا ہے۔ بے شک انسان صورتِ الٰہی میں تخلیق ہوا اور اس میں صفاتِ ربانی کا کمزور سا عکس موجود ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ذات ربانی کی صفات کو انسانی سطح پر لا کر دیکھا جائے۔ انسان خدا کا جو تصور بناتا ہے وہ تو صرف ایک واسطہ، ایک علامت ہے جس کے ذریعے وہ تخلیق سے ورا خالق کی دنیا میں پہنچ سکتا ہے۔ خدا کے اس کمزور تصور سے الجھ کر اور مایوس ہو کر عیسائی فرد گستاخی پر اتر آیا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کی مریض دنیا کو دیکھ کر سوچتا ہے کہ اسے کس کمزور خدا نے تخلیق کیا ہے۔ یورپین ہمیشہ سے سادہ دماغ رہے ہیں، علامت کو ہی حقیقت سمجھ بیٹھتے ہیں اور ہر چیز کو اپنی سطح تک لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ آخر کار وہ المطلق کو آسمان پر رہنے والے ایک بوڑھے آدمی کی سطح پر لے آئے ہیں اور پھر یہ دیکھ کر انھیں سخت دھچکا لگا ہے کہ یہ بوڑھا آدمی کس قدر بیکار ہے۔

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے ورثے کو یاد کریں قدیم دانش پر توجہ دیں اور اوپر کی طرف اور اپنے اندر کی طرف دیکھیں..... جوابات تو ہمیشہ سامنے ہوتے ہیں، زمانے کی دستبرد سے محفوظ، یادِ خدا کے پرکھوں پرانے وسیلے میں، ہم سے بالاتر، یہاں اور اس وقت ہماری ذات کی عمیق تہ میں موجود ہیں۔ ہمیں صرف صحیح سمت میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

کہاں سے آئے ہیں، جاتے کہاں کو ہیں

معاصر فکر نے بہت سے ایسے اعتقادات کو جنھیں ہمارے آباؤ اجداد دین کے اساسی عناصر کو گردانتے تھے، بچگانہ یا سادہ لوح کہ کر مسترد کر دیا ہے۔ لیکن ایک تصور ایسا بھی ہے جسے عیسائیوں نے ایک برہمی اور حقارت کے ساتھ رد کیا ہے اور وہ ہے جزا اور سزا کا تصور۔ یعنی یہ خیال کہ ہمارے ہر فعل کی بازگشت انسانی دنیا کی حدوں سے پار اوپر تک جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں ہم پر عتاب یا عذاب نازل ہوسکتا ہے۔ پہلے وقتوں میں ان نتائج کو ہماری اپنی دنیا کی زبان میں بیان کیا جاتا تھا۔ یعنی جہنم کی آگ اور جنت کے باغات اور نہریں وغیرہ۔

جدید عیسائی یہ کہتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ آسمانی باپ اپنے پُرخلوص بچوں کو ان لغزشوں یا کوتاہیوں کی سزا دے جو آخر کار انسانی کمزوری یا ماحول کے اثر کے تحت مجبوراً سرزد ہو گئیں؟ ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہیں کریگا۔ لیکن یہ سوال بھی تو اٹھ سکتا ہے کہ پھر وہ اور بہت سی چیزوں، آفتوں اور مصائب کو دنیا میں پھلنے پھولنے کی کیوں اجازت دیتا ہے؟ جنگ، استبداد، قریبی لوگوں کی جواں مرگی، سرطان اور بہت سی جسمانی اور ذہنی کمزوریوں کو۔ اس دنیا میں تکلیف اور دکھ کی موجودگی سے کون انکار کرسکتا ہے تو پھر یہ فرض کرنا سراسر غیر منطقی ہے کہ کسی اور جگہ خدا اس تکلیف کی اجازت نہیں دے گا۔

ہم اپنے اعمال و افعال کی ذمہ داری سے بھاگ نہیں سکتے جیسا کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ قرآن کہتا ہے ''اس روز زبانیں بند رہیں گی اور تمہارے ہاتھ پیر تمہارے خلاف گواہی دیں گے''[1]۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا انسان کی مرکزی انفرادیت یا انا اور اس کے افعال کے درمیان کوئی بنیادی امتیاز نہیں۔ جو کچھ ایک شخص کے ساتھ ہوتا ہے یا جس چیز میں وہ حصہ لیتا ہے وہ سب اس کی فطرتِ کلی کا ایک پہلو ہے۔ انسان بحیثیتِ مجموعی اور زمان و مکان میں ظاہر

۱- قرآن کریم، ۳۶:۶۴

ہونے والے ایک منفرد نقش ہستی کے طور پر اتفاقات وحوادث کا شکار نہیں ہے۔ انسان کے لیے یہ فطرتِ کلی ابھی نامکمل ہے کہ وہ تبدیلی اور تشکیل کے عمل سے گزرا نہیں ہے لیکن ہمارے وجودی سیاق سے باہر وہ مکمل ہو چکی ہے اور ہمارا تجربہ حقیقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہم حقیقتاً آزاد ہیں لیکن اضافی حد تک۔ مطلق آزادی تو صرف حق تعالیٰ کو نصیب ہے۔

جہنم کے روایتی تصور کو سمجھنے کے لیے ہمارے تجربے، تاثرات اور واقعات کے شعور کو سمجھنا ضروری ہے جن سے ہم جہنم میں گزریں گے۔ سیموں ویل نے لکھا ہے معتوب روحیں جنت میں ہونگی لیکن ان کے لیے جنت بھی جہنم ہے۔'' اس طرح بدھ لوگ کہتے ہیں کہ جہنم ایک مقام نہیں بلکہ وجود کی ایک حالت ہے اور ہمارے لیے تجربے کی ایک حالت ہے۔ یہ تجربہ معیار کی موجودگی میں نامکمل ہونے کا ہے۔ معتوب روح آگ میں جلتی رہتی ہے لیکن خود آگ نہیں بن پاتی۔ اپنی اصل یعنی وجود ربانی میں ضم نہیں ہو سکتی اور یہی اس کا عذاب ہے۔ جب کسی چھوٹے سے گناہ کی سزا ملتی ہے تو وہ دراصل اس فعل کی سزا نہیں بلکہ اس گہری داخلی کجی کی سزا ہے جو اس گناہ کے ذریعے ظاہر ہوئی۔

مسلمانوں نے جدیدیت سے متاثر ہونے کے باوجود ارضی زندگی کے نشیب وفراز کو اللہ تعالیٰ کی دو صفات یعنی قدرت اور رحمت کے حوالے سے دیکھنا نہیں چھوڑا۔ وہ کبھی اس پھندے میں گرفتار نہیں ہوئے جس کا ہر وہ شخص لازماً اسیر ہو کر رہتا ہے جس نے اللہ کی علامتی تجسیم کو اس کی جائز حدود سے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ ''سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ'' اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے۔ ان کے ہاں خدا کا تصور جل جلالہ، قادرِ مطلق کا ہے جس کی بزرگی اور شان کو زبانِ نطق بیان کرنے سے قاصر ہے۔ یہ تصور اس تصورِ خدا سے بھی الگ ہے جس میں خدا کو ایک ایسے اچھے آدمی کے روپ میں دکھایا جاتا ہے جس میں انسانی اوصاف بہت بڑے ہو کر نظر آئیں اور اس تصور کا دور کا تعلق بھی اس تصورِ خدا سے نہیں جوڑا جا سکتا جس میں خدا ایک آسمانی پیرِ مرد سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ہم انسانوں کو تشبیہ اور تمثیل کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ مگر اس کی حیثیت صرف ایک زینے کی سی ہے جو ہمیں اس تک لے جاتا ہے جو تصور و قیاس اور صورت و شباہت سے بالاتر ہے۔ لیکن جب ہم ان سہاروں پر ذرا زیادہ انحصار کرنے لگتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کیسی عارضی حیثیت کی چیزیں ہیں۔

دوزخ کے خوف نے ان گنت مردوں اور عورتوں کو غلط راستے سے موڑ کر اپنے اصل مقصد کی

طرف لوٹ آنے اور اس کی طرف بڑھنے پر مجبور کیا ہے۔ ورنہ وہ شاید ہمیشہ کے لیے تاریکی میں کھو جاتے۔ اگر خوف انسان کو محفوظ راستے پر لے آتا ہے اور اسے اپنے اصل تشخص کی پہچان کروا دیتا ہے تو پھر یہ خوف ایک مثبت چیز ہے۔ پھر چونکہ انسانی ذمہ داری موجود ہے اور انسانی افعال کے نتائج ان کے کرنے والے تک ضرور پہنچتے ہیں تو پھر ہمیں یقیناً بہت سی چیزوں سے ڈرنا چاہیے۔ لیکن نارِ جہنم کے تصور میں گڑبڑ یہ ہے کہ اس سے ایسا تاثر ملتا ہے گویا سزا کہیں باہر سے مسلط کی جا رہی ہو اور جدید آدمی جو پہلے ہی داخل سے کٹ چکا ہے اس تصور کی بدولت مزید اجنبیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے اس لیے کہ وہ اس کے اصل معانی سمجھ نہیں پاتا۔

چونکہ ذمہ داری کا نظریہ اگر محض سماجی اقلیم تک محدود رہے تو بے وزن ہو جاتا ہے جبکہ اس اقلیم سے باہر اس نظریے اطلاق کا مطلب یہ ہے کہ انسانی افعال کے فوق الانسانی نتائج ہو سکتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دینی اصطلاح میں ہمارے افعال کا حساب کوئی باہر بیٹھا ہوا آدمی نہیں لیتا جو مطلق العنانی سے کائنات پر حکم چلاتا رہتا ہو بلکہ ہمارے اندر خلقی طور پر جو معیار موجود ہے وہ ہمارے خلاف فیصلہ کرتا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ''جو بھی گناہ کرتا ہے وہ اپنے خلاف کرتا ہے۔''[1] اور یہ بھی کہ ''اپنی کتاب کو پڑھو''[2] تمہارا نفس ہی آج کے دن تمہارے خلاف گواہی دے گا۔ ہر دین کی تعلیم یہ بتاتی ہے کہ آخرت کا حساب یہی ہوگا کہ تمام بناوٹ اور خود فریبی غائب ہو جائے گی اور ہم جو کچھ اصل میں ہیں وہ ظاہر ہو جائے گا۔ ہمارا اصل تشخص ہم سے پوشیدہ رکھا گیا ہے تاکہ ہم آزادی اور ذمہ داری سے اس دنیا میں عمل کر سکیں۔ لیکن آخر کار جب پردہ اٹھ جائے گا۔ کھیل ختم ہو جائے گا تو ہم خود اپنا سامنا کریں گے۔

جہنم انسان کی اپنے داخل سے دوری ہے اور ایسی مہیب دوری کہ معتوب روحیں اپنی کلیت کا تجربہ صرف اور صرف عذاب اور تکلیف کی صورت میں ہی کر سکتی ہیں۔ اس پاگل کی طرح جسے اپنے چاہنے والے بھی اپنے دشمن نظر آتے ہیں اور پانی کے لیے ترستے اس سگ گزیدہ مریض کی طرح جو پانی سامنے ہونے کے باوجود پیاس کے عالم میں دم توڑ دیتا ہے۔ جہنمی بھی ایک منحوس خواب میں

۱- قرآن کریم، ۴:۳

۲- قرآن کریم، ۱۴:۷

الجھے ہیں جہاں مہربان چیزیں بھی دشمن دکھائی دیتیں ہیں۔ یہ جہنمی حالت اپنے اصل کو پہچاننے سے انکار کا نتیجہ ہے کہ ہمارے افعال اور ان کے نتائج بہت دور تک اہمیت رکھتے ہیں۔

شوآں لکھتے ہیں ''چونکہ ہم ذاتِ خدواندی سے لاتعلق نہیں ہو سکتے اس لیے ابدیت ہماری قسمت ہے۔ ابدیت ہماری گھات میں ہے اس لیے ہمیں مرکز کو دوبارہ سے تلاش کرنا ہے جہاں ابدیت رحمت ہے۔ لیکن اگر ہم مرکز کی بجائے محیط پر رہ گئے تو پھر جہنمی ابدیت یا ابدی جہنم ہمارا مقدر ہے۔ جہنم اس محیط اور اس انا کی تقدیر ہے جو خود کو مرکز اور مطلق سمجھ بیٹھیں ہو''..... ہم کچھ بھی کر لیں اپنی اصلیت نہیں بدل سکتے۔ ہم صرف بہروپ بھر سکتے ہیں اور اپنی خلافت کی ذمہ داریوں کو اس بہروپ تلے چھپا سکتے ہیں لیکن روز حساب یہ بہروپ اتر جائے گا۔

اپنے تشخص خلافت کو جو کہ انسان کی آسمانی وراثت ہے فراموش یا مسترد کر کے انسان اپنے وجود کی ایک جنت کھو دیتا ہے لیکن اس لولے لنگڑے پن سے اسے خود مختاری اور ذمہ داری سے آزادی کا ایک احساس ملتا ہے جیسے کوئی نواب زادہ ڈاکو بن جائے اور یہ بھول جائے کہ اس کا محل گروی رکھا ہے اور اسے قرضہ ادا کرنا ہے۔ اس مصنوعی آزادی کے ذریعے معاصر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ممکن ہوئی ہے۔ طبعی دنیا کے بے نظیر استحصال نے جنم لیا ہے اور انسان نے اپنے ہم جنسوں اور اپنے طبعی ماحول کے خلاف بے حد گھناؤنے جرم کیے ہیں اور بغیر کسی احساسِ جرم کے کیے ہیں۔ کیونکہ وہ تو! ہجوم کے ایک فرد کی حیثیت سے عمل کر رہا تھا۔ اس کے باوجود انسان کو اپنی انفرادی زندگی میں جرم کے خبط آمیز احساس سے نجات نہیں مل سکی۔ تاریخ میں انسان کبھی خطرے کا سامنا کرنے سے اتنا خوفزدہ نہیں رہا جتنا آج ہے۔

انسانی ذمہ داری کے استعمال کرنے والے کو خطرہ یا نقصان مول لینے کے لیے اور شدید احساس جرم کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ لیکن یہ بوجھ بھی اسی انسان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے جو اسے زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول نہ کرے۔ جو سپاہی حکم کے تحت قتل کرتا ہے یا جو سرکاری ملازم قوانین کی تکمیل کروانے میں کسی کو اذیت پہنچاتا ہے وہ خود کو ذمہ داری سے آزاد سمجھتے ہیں کہ حکم کے نوکر ہیں۔ ''قانون ہم نے تو نہیں بنایا'' وہ کہتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر عمل ایک عمل کرنے والے کی طرف لوٹتا ہے اور ان کا عمل بھی انھی کی طرف پلٹ کر آئے گا۔ ان

ناعاقبت اندیشوں نے یہ فرض کرلیا ہے کہ جب تک وہ یونیفارم یا دفتری لباس میں ہیں انسان سے کچھ کم تر درجے کی مخلوق ہیں۔

کیا وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ذمہ داری صرف حکم دینے والے پر ہے؟ آخر وہ خدا کے بندے ہیں اپنے جیسے انسانوں کے نہیں اور اگر وہ انسانوں کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ ان کا انتخاب ہے اور اس کی ذمہ داری ان ہی پر ہے۔ قرآن میں شیطان کے الفاظ ہیں: ''مجھے تم لوگوں پر کوئی اختیار نہیں سوائے اس کے کہ میں نے تمہیں پکارا تم نے میری اطاعت کی پھر مجھے الزام مت دو بلکہ خود کو الزام دو۔''[1]

گناہ کے شعور میں اس بات کی ذاتی اور عقلی شناخت ہوتی ہے کہ ہم کہاں سے آئے اور کہاں جارہے ہیں۔ اسی سے اپنے ذمہ دار مخلوق ہونے کا علم اور تحقق ہوتا ہے۔ احساس گناہ ایک جذباتی حالت کے طور پر انسان کو مفلوج اور اس کے انسانی رشتوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ لیکن گناہ کا عقلی شعور ہمیں اس بات کی شناخت کرواتا ہے کہ ہم وہ نہیں جو ہمیں ہونا چاہیے تھا اور ہم اپنی قوتوں کا غلط استعمال کرتے ہیں اور اپنی سلطنت پر صحیح طرح حکومت نہیں کرتے۔

لیکن چونکہ ہم وہیں سے شروع کر سکتے ہیں جہاں ہم موجود ہیں اور جہاں خود کو پاتے ہیں وہیں سے عمل کا آغاز کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اس کام کا آغاز ایک مریض کے طور پر کریں گے کہ جس دنیا سے ہمیں واسطہ پڑتا ہے وہ تباہ شدہ جنت ہے۔ درجۂ کمال بہت دور ہے اور ان حالات میں جہاں نیکی اور بدی گلے ملے ہیں اور تاریکی اور اجالا گڈمڈ ہیں صرف کوئی ولی ہی احساس گناہ کو بڑھائے بغیر پوری ذمہ داری سے عمل کر سکتے ہیں۔

ہم سے اس بات کا تقاضا نہیں کیا جارہا کہ عمل میں وہ خالص پن پیدا کریں جو اب ناممکن ہے بلکہ یہ کہ جو کچھ ہمارے میدان عمل میں موجود ہے اسے مرکز کے حوالے سے دیکھیں، چیزوں کو ان کی اصل جگہ پر رکھیں اور اس مرکزی وحدت کو بحال کر دیں جو بکھر چکی ہے۔ یہ ہم تبھی کر سکتے ہیں اگر اپنی اصل صورت حال کو سمجھیں اور مرکز پر توجہ مرکوز کر کے اپنے موجودہ حالات کے بکھرے ہوئے عناصر کو اس کی طرف لائیں۔

انسان کے لیے پیدائش کے وقت سے ہی دو طرح کے سفر یا دو سطحوں پر سفر کرنا مقسوم ہو جاتا ہے۔ ایک سفر تو وہ ہے جو ناگزیر ہے۔ یعنی زندگی میں تجربے اور عمل کا سفر جو وقت کے ساتھ ساتھ

۱- قرآن کریم، ۱۴:۲۲

طے ہوتا ہے اور اس کے نتیجے کے طور پر کسی خاص عہد کا ایک آدمی اور اس آدمی کی داستان تخلیق ہوتی ہے جو اس کے حتمی تشخص یا اس خاص صورت میں اس انسانی امکان کو ظاہر کرتی ہے جو اس کے وجود کی بنیاد ہے۔

دوسرا سفر وہ ہے جس سے کسی حد تک کترا کر گزرا جا سکتا ہے۔ یہ ہے وقت کے دھارے کی مخالف سمت میں سفر۔ اس میں وقت اور مقام کو نقطۂ آغاز بنا کر بالاتر حقیقت تک رسائی کی کوشش ہوتی ہے۔ یہ سفر بے شمار اساطیر، دیومالا اور داستانوں میں بیان ہوا ہے۔ وجود کے مرکز کی طرف جانے والا دشوار اور خطرناک راستہ جو عارضی اور جعلی سے ابدی حقیقت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس سفر کے لیے منظر مہیا کرنے کی خاطر ''دیوِ انتشار'' کو ذبح کیا گیا اور ایک منظم کائنات سمندر سے برآمد کی گئی اور اس منظر میں ایک آسان راستہ فراہم کرنے مسیح علیہ السلام نے جان دی اور محمد ﷺ مدینہ کے لوگوں کو صحرائے عرب میں جہاد کے لیے لے گئے۔

ایک معیاری (نارمل) معاشرے میں پہلے سفر کے حالات دوسرے سفر کے لیے سہارا فراہم کرتے ہیں ماضی میں انسانوں کا مطمحِ نظر یہ ہوتا تھا کہ ایسا سماجی اور طبیعاتی ماحول برقرار رکھا جائے جس میں ہر چیز کے دو رُخ تھے۔ ایک طرف وہ پہلے سفر کی ایک ''شے'' تھی اور دوسری طرف دوسری منزل کی علامت اور سنگ میل۔

دنیا کی آخری عظیم اور دنیا پلٹ وحی یعنی اسلام میں فریضہ حج پر جو اتنا زور ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ دونوں زندگی کے ان دو مسافتوں کے راستے الگ الگ ہو گئے ہیں۔ ایک متقی مسلمان جب حج کرنے جاتا ہے تو اپنے اندر مرکز کی طرف ایک سفر کرتا ہے اور اس طرح وہ نماز پڑھتے وقت اپنے جائے نماز کی صورت میں گویا ایک دنیوی ماحول میں ایک مقدس اور متبرک مقام بنا لیتا ہے اس زاویے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے مقدس قوانین اس دنیا میں مسافر کے تحفظ کے لیے بنائے گئے جو اسے پاؤں ٹکانے کی کوئی جگہ نہیں دیتی۔

انسانی دنیا انحطاط میں جا رہی ہے اور انحطاط ناگزیر ہے۔ ہم لمحۂ حاضر میں، یہاں اس وقت اپنے آپ میں مجبور ہیں۔ لیکن ہمیں کچھ عوضانہ بھی ملے گا، ایسا اجر جو پہلے وقتوں کے کم زوال یافتہ انسان کو نہیں مل سکتا۔ ہادی برحق نے فرمایا ''تم اس زمانے میں ہو جہاں اگر تم دینی احکامات میں سے دسویں حصے کی بھی خلاف ورزی کرو گے تو تم پر عذاب ہوگا اور آگے ایسے زمانہ آنے والا ہے

جب امت کا کوئی شخص ان احکامات کا دسواں حصہ بھی بجالائے گا تو اس کی بخشش ہو جائے گی۔

جدید انسان کمزور ہے اور اس کا ماحول اسے کوئی روحانی سہارا مہیا کرنے کی بجائے الٹا اسے بھٹکانے کا کام کرتا ہے۔ وہ دینی اور مذہبی بغض کے ماحول میں رہ رہا ہے۔ اس لیے داور حقیقی کا انصاف اس پر کرم کرتا ہے اور اسے ان بنیادوں پر نہیں پرکھتا جن پر اس کے آباؤ اجداد کو پرکھا جاتا تھا۔ لیکن اس خاص کرم کے باوجود ایک گناہ یا جرم ایسا ہے جو نا قابل معافی ہے اور وہ ہے رحمت کو قبول کرنے سے انکار۔ ہم ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح ہیں جسے ایک ہاتھ بچانے کی کوشش کر رہا ہے اگر ہم اس ہاتھ کو پہچاننے سے انکار کر دیں تو ہمارے لیے کوئی امید باقی نہیں رہتی۔

جدید زندگی کی پیچیدگی محض سطحی ہے۔ مصنوعی ضروریات، جعلی فرائض، ادنیٰ مقاصد اور امنگیں اور سفر انسانی کے حقیقی زادِراہ کے بدلے چمکدار مگر بے تسکین کھوکھلے متبادل۔ یہ ہے وہ چیزیں جس سے اس پیچیدگی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔

تمام مذاہب میں جو فقر کو قابل تحسین سمجھا گیا ہے اور دولت و ثروت کی مخالفت کی گئی ہے اس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ جاہ و ثروت کا حصول ایک ادنیٰ نصب العین ہے اور اس کی خاطر افضل اور حقیقی مقصد کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مخالفت صرف تب کی جاتی ہے جب یہ خطرہ ہو کہ انسان کی قوتوں اور توجہ کو اس حد تک ضائع اور منتشر کر دے گا کہ وہ اسے وہاں استعمال کرنے کے قابل نہیں رہے گا جہاں انھیں استعمال ہونا چاہیے۔ ہم اپنی تمام تر توجہ کو، جو اس قدر قوی ہے کہ حق کی روشنی پر پڑے پردوں کو چاک کر سکتی ہے، کمیت اور اضافیت کی اقلیم پر مرکوز کر کے ہی اپنے عہد کے سائنسی اور تکنیکاتی عجوبے تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کوئی بھی قوم یہ کر سکتی تھی اگر وہ اپنے اصل روحانی مقاصد کو ان اضافی تحصیلات پر قربان کرنے کو تیار ہو جاتی۔ لیکن اس میں پہل کرنے کا ''اعزاز'' یورپین قوموں کو ہی حاصل ہوا کہ انھوں نے سب سے پہلے روشنی کی طرف سے منہ موڑ کر تاریکی کی کوکھ سے حیرت انگیز نمونے تخلیق کرنے کی کوشش کی اور پھر باقی اقوام بھی ان کے نقش قدم پر چل نکلی ہیں۔ یہ خیال ہی مضحکہ خیز ہے کہ انسان دونوں طرف کامیاب ہو سکتا ہے۔ انسان کی توجہ دو مخالف سمتوں میں کبھی بھی مرکوز نہیں ہو سکتی۔

ہم حقیقی ہیں اور اصل سے مطابقت رکھنا چاہتے ہیں۔ جبکہ یہ عالمِ کیف کم سایوں کی دنیا ہے اور خطرہ یہ ہے کہ جس قدر یہ دنیا بے صلہ ہوتی ہے اتنا ہی ہماری تسکین کی جستجو بھی بڑھتی ہے اور

ہم عجلت اور ہنگامے میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ مطلق کے لیے ہماری فطرت میں جو تشنگی ہے اسے جزوی اشیا پر پوری قوت سے مرکوز کر دیا گیا ہے۔ اعداد میں بہتات کی تلاش اور ڈھکوسلوں میں حقیقت کی جستجو انتشار کو جنم دیتی ہے اور اس کا آخری نتیجہ تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

جو شخص ارذل چیزوں کو کروفر کی خلعت پہناتا ہے اور اصل کی اشد طلب کا ان پر اطلاق کرتا ہے وہ بالآخر ایک مایوس کلبیت زدہ بن جاتا ہے جس کو التباس اور خوش فہمی ٹوٹنے کے بعد زندگی میں کھوکھلے پن کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

ہمارے عہد کی مخصوص نوعیت کے پیش نظر اس میں خوش فہمی کا اُٹھ جانا اور خوش آیند امیدوں کا ٹوٹنا نہایت ضروری ہے اس کے بغیر ہم جہاں ہیں وہاں مطمئن بیٹھے رہیں گے۔ کہ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہماری خوش فہمیاں بکھریں گی تو تبھی ہم یہ جان پائیں گے کہ دنیوی اقلیم ایک دیوانے کی کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جس میں شعور اور غصہ زیادہ ہوتا ہے مطلب نہیں ہوتا۔ پھر شاید کچھ لوگ اپنی ذمہ داری کو یاد کریں اور ایک نجس ماحول کو پھر سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔

پہلے وقتوں میں انسان آسانی سے ایک انتہائی فعال زندگی اور ایک شدید روحانی توجہ کو باہم ملا کر چل سکتے تھے۔ لیکن آج نہ صرف یہ جدید آدمی کے بس سے باہر ہے بلکہ ہمارے پیشے ہماری آسائشیں اور سہولتیں اسقدر توجہ اور محنت طلب ہیں کہ ہم میں روحانی اکتساب کے لیے وقت اور حوصلہ نہیں رہتا۔ اس طرح یہ سہولتیں ہی اتنی مہنگی پڑتی ہیں کہ ان کے بدلے اپنی انسانیت کھونی پڑتی ہے۔ ہماری تمام تر صلاحیتوں کو سماجی دولت کے حصول میں لگا کر جو معاشرہ وجود میں آتا ہے اس میں تمام اقدار پیداواری عمل کے ماتحت ہیں۔

اس مسابقتی معاشرے میں آرام کرنے والا دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ جبکہ آرام وسکون کے بغیر انسان اس دوسرے سفر کے لیے کوشاں نہیں ہوسکتا یا اپنی نجات کی فکر نہیں کرسکتا۔ لیکن جب تک انسان اپنے آپ کو مقدار وکمیت کی اس اقلیم سے آزاد کر کے اپنا رُخ اپنے مرکز کی طرف نہ کر لے، اس منصبِ انسانی جانب جو خلافتِ الٰہی کا تقاضا ہے، تو وہ اپنے اختیار وانتخاب کو برت نہیں سکتا جو اس چھوٹے سے قصرِ سلطانی کے میر وسلطان کی حیثیت سے استعمال کرنا اس کا پیدائشی حق ہے۔

کئی شعبوں میں سمجھوتا ممکن ہے کہ سمجھوتا انسانی دنیا کی ایک شرط ہے لیکن ایک بات پر سمجھوتا ناممکن ہے اور وہ ہے سمت کا انتخاب۔ ہم ایک دماغ اور ایک دل رکھتے ہیں اور ایک وقت میں ایک

ہی سمت کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ آخرالامر انسان کا حساب اضافی نیکی یا اضافی بدی کے حوالے سے نہیں ہوگا۔ بلکہ اس پر ہوگا کہ اس نے کس سمت کا انتخاب کیا۔

آج کل یہ حقیقت کافی حد تک لوگوں کی نظر سے اوجھل ہو چکی ہے کہ ہمیں انتخاب کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس وقت بیٹل ہائم کے الفاظ میں ہمارے پاس دو راستے ہیں۔ ہمیں آزادی اور جدید ٹیکنالوجی کی سہولتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے اور یہ بات اب واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ آزاد معاشرہ اور تکنیکی معاشرہ ایک جگہ اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

ہم جان بوجھ کر روایتی اور فطری نقطۂ نظر کو رد نہیں کرتے۔ ہم دراصل بھول چکے ہیں کہ مسجود ملائک آدم کے وارثوں کو کیسا ہونا چاہیے اور وہ کیسے ہوا کرتے تھے؟ اس لیے ہم آدمی سے بالشتیے اور شاہ سے بوزنے ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کے باوجود حق وہی ہے جو ہمیشہ سے رہا ہے۔ انسان خلیفۃ اللہ اور اشرف المخلوقات ہے اور وہ اب بھی اپنی توجہ اپنا عشق اور اپنی عمیق ترین طلب کو صحیح سمت میں مرکوز کر کے کسی نہ کسی حد تک حق کو پہنچ سکتا ہے۔

روایتی عقائد میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ وقت کے ساتھ انحطاط کا عمل ناگزیر ہے اور انسان زوال کے ساتھ ساتھ اپنی گم گشتہ جنت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی مذکور ہے کہ انسان صرف انتخاب کے لیے ہی نہیں بلکہ واپس آنے اور واپس لانے کے لیے بھی بنا ہے۔ ساری مخلوق میں سے صرف وہی ایک ہے جو مرکز سے رابطہ قائم رکھ سکتا ہے اور بادلوں کی دبیز تہوں کو چیر کر آفتاب کی روشنی سے باخبر رہ سکتا ہے۔ جب تک وہ اپنے اس منصب خلافت کو پورا کرتا رہتا ہے دنیا میں معانی برقرار رہتے ہیں۔ جب وہ ہٹ جاتا ہے تو انتشار اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

ہمارے پاس اب نامردی اور سستی کا وقت نہیں ہے پچھلے پچاس سالوں کے واقعات سے یہ سبق ملتا ہے کہ مغرب کے آدمی نے جس عمل کو اپنایا تھا اب تیز تر ہوتا جا رہا ہے اور ترقی کے راستے پر وہ جگہ جلد ہی آنے والی ہے جب واپسی کا راستہ مسدود ہو جائے گا جب کوئی اصل انتخاب ممکن نہیں ہوگا۔ ہم نے جو دنیا بنائی تھی وہ ہمیں چاروں طرف سے گھیرے میں لے رہی ہے، دباؤ بڑھ رہے ہیں اور سال بہ سال انسان کو مشین بنانے کی تکنیک میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جس قسم کی ترقی یا بڑھوتری ہماری دنیا میں ہو رہی ہے وہ صرف اپنے قوانین کی پابند ہے ہمارے یا خدا کے قوانین کی نہیں۔

ساری تخلیق کردہ کائنات میں سے صرف انسان نے خلافت کا بوجھ اٹھایا تھا۔ اب وہ اسے اتار کر نہیں پھینک سکتا۔ چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں ہم اپنے قلمرو میں ہونے والے واقعات کے لیے جوابدہ ہیں۔

انتخاب کا فرض ہر شخص پر عائد ہوتا ہے چاہے وہ کسی بڑی تنظیم کا پرزہ ہو یا ایک معمولی غیر اہم سا انسان۔ اس کا بوجھ اور کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اگر وہ معاشرے سے سمجھوتہ کر بھی لیتا ہے تب بھی اسے اس بات کے لیے جوابدہ ہونا پڑے گا کہ اس کے تعاون سے معاشرے یا اس کے گروہ یا تنظیم نے کس قسم کے کام کیے جو جرم مل کر کیا جائے اس میں خاموش تماشائی بھی مجرم ہے۔

دنیا کے رہنما یا وہ مفروضہ حکمران ایک کے بعد دوسرے بحران سے نپٹنے میں اتنے مصروف ہیں کہ انھیں اپنی مشقتوں سے سر اٹھا کر یہ دیکھنے کی مہلت نہیں کہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ مردِ خدا بننے کی سکت اور وقت نہیں رکھتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کی مصروفیت اور عجلت کی زندگی ضرورت کے تحت نہیں ہے دباؤ کے تحت ہے۔ وہ ایک مستقل سرگرمی میں جو تغیر کے بخار سے پیدا ہوتی ہے بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ اس بخار کی گرفت میں آ کر اور تیزی سے پستی کی طرف جاتی ہوئی دنیا کی گاڑی میں سوار ان کی حالت یہ ہے کہ ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں''۔ اس افتاد کو نہ تو روکنا ممکن ہے نہ ہی اس کا رخ بدلنا کہ یہ جدید دنیا کی تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔ چنانچہ یہ عمل جاری ہے اور رفتار بڑھ رہی ہے۔ جو لوگ اس گاڑی سے چھلانگ لگا کر کسی آخری متبرک پناہ گاہ میں دنیا کے ساکن مرکز پر کھڑے اس گاڑی کو پہاڑی سے نیچے لڑھکتے دیکھ رہے ہیں وہ عنقریب دھات کے ایک بڑے سے گرم تودے کو، نفوسِ انسانیہ سے لدے ہوئے اس چکر کو دورِ عدم میں گم ہوتے دیکھ لیں گے۔

معاصر سوچ اور رویوں کی تہ میں یہ نظریہ ہے کہ ہماری ارضی زندگی ہی دراصل سب سے اہم ہے اور انسانی معاشرے کی پرسکون تنظیم جو باقی تمام ملحوظات پر مقدم ہے۔ جو مذہبی پیشوا، شرفا، سورما، فانی زندگی کے پار ایک لازوال عظمت پر نظر رکھتے تھے وہ عنقا ہو چکے ہیں۔ صرف بورژوا اور پرولتاری رہ گئے ہیں اور ان کے لیے تیل چولہا ہی ساری حقیقت ہے اور انسان کی اہمیت اس کی معاشرہ میں افادیت کے لحاظ سے جانچی جاتی ہے چاہے معاشرہ خود کسی اصلی قدر اور مقصد حیات سے محروم ہو چکا ہو۔

جب سچ مغالطے کی دنیا میں اترتا ہے تو اس کا سکون ضرور درہم برہم ہوتا ہے اور معاشرے کی تنظیم بھی اکھڑ جاتی ہے۔ جب انسان خلافت کی ذمہ داری سنبھال کر ایسے فیصلے خود کرنے لگتا ہے تو

پھر وہ مشین کا بے حس پرزہ نہیں رہتا اور یوں مشین کی کارکردگی میں یقیناً خلل پڑتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم مشین کے پرزے بننے کے لیے پیدا نہیں ہوئے۔ جو تہذیب اس بات کو نظر انداز کر دیتی ہے وہ اپنے ہاتھوں خود تباہ ہوتی ہے۔ ہمارے حق میں یہی بہتر ہے کہ مصنوعی زندگی سے نکل کر فطری اور طبعی زندگی اور ماحول کے خطرات کا مقابلہ کریں کہ یہی انسانی زندگی کی عظمت ہے اور خلیفۃ اللہ کا منصب بھی۔ ہمیں اس ایک زندگی میں جو انفرادی وجود کی صورت میں ہمیں دی گئی ہے اپنے انسان ہونے کا تحقق کرنا ہے۔

وقت گزر جاتا ہے، ماں باپ دنیا سے چلے جاتے ہیں، بچے بڑے ہو کر اپنی زندگیاں شروع کر دیتے ہیں جوانی کی محبت یاد بن جاتی ہے، پرانے دوست ساتھ چھوڑ جاتے ہیں لیکن یہ آدمی چلتا رہتا ہے اور صرف ایک چیز آخر میں باقی رہ جاتی ہے۔ وہ انتخاب جو اس نے کیا اور اس وقت کیا جب وہ انتخاب کرنے کے لیے آزاد تھا۔

ہماری زندگی میں تکلیف یا مصیبت کے جو لمحے آتے ہیں وہ تھوڑی دیر کے لیے ہمیں خواب غفلت سے بیدار کر دیتے ہیں اور حقیقت کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں یہ فیصلے اور صداقت کا لمحہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس لمحے کو گرفت میں لے سکے تو پھر وہ روایت اور دین کی طرف پلٹتا ہے اور اپنے گم گشتہ ورثے کو پھر سے پرکھتا ہے۔ اگر وہ مخلص ہے تو یقیناً اس قید سے فرار کا راستہ چاہتا ہوگا جس میں جدید معاشرے نے اس کو ڈال رکھا ہے۔ لیکن اس فرار کے لیے اسے اپنے موجودہ نظریات کا کاٹھ کباڑ یہیں چھوڑنا ہوگا کہ جیل سے فرار ہوتے وقت سامان ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ جب تک ہمارے ذہنوں میں اُگی گھاس پھوس صاف نہیں ہوگی بیج کا بیج نہیں پنپ سکتا اور نمو نہیں ہو سکتی۔

جدید آدمی کو اس قید سے نکلنے، مرکز سے رجوع کرنے اور آزادی سے اپنے منصب خلافت کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے مذہب کو قبول کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دماغ سے مذہبی اصولوں، اسلوب اور طرز زندگی کے خلاف تعصب نکال دے کیونکہ یہ سب چیزیں مذہب کے وجود کے لیے ضروری ہیں اور ان کے بغیر اس کا ڈھانچہ قائم نہیں رہ سکتا۔

اسلام کہتا ہے کہ جو شخص خدا کی طرف ایک قدم بڑھتا ہے خدا اس کی طرف دس قدم آتا ہے۔ اس پہلے ایک قدم کو اٹھانے کے لیے بچے کی سی بے ساختگی اور بالغ آدمی کی سی فیصلے کی پختگی درکار ہے۔ ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھے گا تو ہم چلیں گے اور چلنے سے ہی منزل پر پہنچیں گے۔

ہم اس سفر میں اکیلے نہیں ہیں ہم سے پہلے ان گنت انسان اس راستے سے گزرے ہیں اور ابدیت کے ساحل تک پہنچتے ہیں۔ ایک بدھ مصنف لکھتا ہے کہ ''جس طرح آگ کی فطرت میں جلنا ہے اسی طرح انسان کی فطرت میں بیدار رہنا ہے۔''

ہم بہت سے پریشان خوابوں میں مگن سو رہے ہیں لیکن اس راستے کا مسافر ایک ایسی بیداری کی طرف بڑھ رہا ہے جس میں اس کے خوابوں کی تمام حقیقتیں پنہاں ہیں۔

انسان کی قسمت کا فیصلہ اس کے انتخاب پر ہوتا ہے کہ وہ بیداری یا خواب میں سے کس کا انتخاب کرتا ہے۔ دھارے کے ساتھ بہتا ہے یا اس کی مخالفت میں تیرتا ہے۔ ہم اور تم، اختیار اور انتخاب کے لیے تخلیق کیے ہوئے بندے، یہاں کھڑے ہیں اور جب تک پردہ نہیں اٹھتا ہم نہیں جان پائیں گے کہ ہمارے انتخاب پر کیا کچھ منحصر ہے۔

اقبال اکادمی پاکستان